عربی دانی کا کوئی ثبوت نہین ملتا، اس قسم کی کتابین تو خالص ہندیون نے بھی لکھی ہین عربی کا صحیح مذاق پیدا کرنے کے لئے مصر کی ہوا کھانے کی نہین بلکہ صحیح تعلیم کی ضرورت ہے، تعجب ہے کہ ازہری صاحب ہندوستان کے ان ادیبون سے واقف نہین ہین جن کی تعلیم تمام تر ہندوستان مین ہوئی ہے مگر ان کی عربیت کا لوہا بڑے بڑے اہل زبان تک مانتے ہین، بہرحال مصنف کی تعلی سے قطع نظر ان کی یہ کتاب عربی اور اردو ترجمہ کی مشق و مہارت کے لئے مفید ہے،

زندگی کا رخ از جناب سعید انصاری صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ،

تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عا/ پتہ:- سنگم کتاب گھر دہلی

بچون کے مستقبل اور ان کی آیندہ زندگی کی کامیابی کا دار و مدار ان کی صحیح تعلیم و تربیت اور ان کے رجحان کے صحیح مصرف پر ہے مگر ان چیزون کی جانب ہندوستانی گھرون مین بہت کم توجہ کیجاتی ہے، لائق مصنف نے جن کو بچون کی تعلیم و تربیت کا عملی تجربہ ہے اس اہم اور ضروری موضوع پر یہ کتاب لکھی ہے اس مین انھون نے زندگی کے پانچ اہم تعلیمی مسائل یا مراحل، بچون پر گھر کا اثر، مدرسہ کی زندگی، بلوغ کے زمانہ، پیشہ کے انتخاب اور ازدواجی زندگی کے معاملات و مسائل پر تعلیمی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور ان کو حل کرنے کے اصول اور عملی طریقے بتائے ہین جس سے زندگی کا صحیح رخ متعین ہو سکے اور بچون کی صلاحیت صحیح راستہ پر لگ سکے اور وہ کامیاب زندگی بسر کرنیکے قابل بن سکین یہ کتاب معلمین اور والدین کے مطالعہ کے لائق ہے،

مقالات یوم حالی شایع کردہ انجمن احیاے ادب پاکستان، تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- انجمن احیاے ادب پاکستان، لاہور

مذکورہ بالا مقالات انجمن احیاے ادب پاکستان لاہور مین یوم حالی کے موقع پر پڑھے گئے تھے اس مین چار مقالات ہین سیرت حالی جناب یحیٰی تنہا صاحب اور اس کا مسدس حافظ جلیل احمد صاحب انصاری، مولانا الطاف حسین مرحوم کی خبر، جناب اختر انصاری، حالی کا پیغام صلاح الدین احمد صاحب ان مین حالی کی سیرت و اخلاق اور ان کے علمی و ادبی کارنامون کا

جلد ۶۸ ماہ ذوقعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۱ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

بابُ التقریظ والانتقاد

شذرات

ایران کے ہندوستانی سفارت خانہ کے علمی و ثقافتی قونصل آقائے سید محمد محیط طباطبائی کی جانب سے دارالمصنفین کے ساتھ علمی و کلچرل تعلقات کے قیام کے لئے فارسی کی چھ اہم کتابین ہدیۃً موصول ہوئی ہین، امام ابو منصور عبدالملک ثعالبی کے عربی شاہنامہ کا فارسی ترجمہ، مترجمہ محمود ہدایت، سلطان سنجر کے مشہور ادیب میر منشی آتابک جوینی کے قلم سے سلطان کی جانب سے لکھے ہوئے مکاتیب کا مجموعہ عتبۃ الکتبہ، ایران کی قومی رزمیہ داستانون کی تاریخ حماسہ سرائی در ایران مؤلفہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، پروفیسر براؤن کی مشہور تاریخ ادبیات ایران کا فارسی ترجمہ مترجمہ علی اصغر حکمت، تاریخ بیہقی اور گلستان سعدی مصححہ مرزا عظیم گرکانی، یہ تمام کتابین تحقیق و تنقید، تصحیح و ترتیب، اور تعلیقات و حواشی کے جدید طریقون سے آراستہ اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر نفیس دیدہ زیب ٹائپ مین چھپی ہوئی ہین، دارالمصنفین اس ہدیۂ اخلاص و مودت کا شکر گذار ہے،

دارالمصنفین اسلامیات کا علمی ادارہ ہے، اسلئے فارسی ادبیات اور اسکے علوم و فنون سے بھی اس کو تعلق ہے، اس کے بانی علامہ شبلی مرحوم نے شعرالعجم کے نام سے پانچ جلدون مین فارسی شاعری کی ایسی مبسوط اور محققانہ تاریخ لکھی کہ خود فارسی زبان مین بھی ایسی کوئی کتاب موجود نہین ہے، اس لئے فارسی ادبیات سے ذوق رکھنے والے اصحاب علم اور فارسی دنیا مین اسکو اتنا حسن قبول حاصل ہوا کہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران مین اس سے فائدہ اٹھایا، اور افغانستان کی وزارت تعلیم نے فارسی مین اس کا ترجمہ کرایا، جو شائع ہو چکا ہے، ابھی حال مین دارالمصنفین نے ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علمی تاریخ پر ایک کتاب بزم تیموریہ تالیف

شائع کی ہے، اس مین تیموری دور کے تمام معروف و غیر معروف شعراء کے حالات آگئے ہین، جو قریب قریب کل ایرانی ہین، فارسی نثر مین اورنگزیب کے مکاتیب کو جو فارسی ادب و انشاء کا اعلیٰ نمونہ ہین، مرتب کرایا جس کی ابھی ایک جلد شائع ہو سکی ہے، اس کے علاوہ علامہ شبلی مرحوم اور اُن کے بعد ارکان دارالمصنفین نے فارسی زبان کے علوم و فنون اور ایران کے مختلف اہل کمال پر بکثرت مضامین لکھے، تیموریون کی علمی و ادبی تاریخ پر جو مضامین لکھے گئے، اُن مین سے بیشتر کا تعلق بالواسطہ ایران سے ہے، اس طرح دارالمصنفین نے فارسی ادبیات اور ایران کے علوم و فنون کی ہمیشہ خدمت انجام دی ہے جس کا سلسلہ انشاء اللہ آئندہ بھی قائم رہے گا،

اس سلسلہ مین ایک بات جس کا تعلق ہمارے ملکی و وطنی مفاد سے ہے، بے اختیار زبان قلم پر آگئی ہے جس کو ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، یون تو ایران اور ہندوستان کے درمیان نہایت قدیم نسلی اور لسانی رابطے ہین مگر ہندوستان کے اسلامی دور خصوصاً تیموریون کے زمانہ سے دونون ملکون کے درمیان اور بھی گوناگون تعلقات و روابط پیدا ہوگئے، تیموریون کا تمدن ایرانی تھا، اُن کی حکومت کی زبان فارسی تھی، اُن کے بیشتر امراء، عمال حکومت، اور ارکین سلطنت ایرانی تھے، اور تیموریون کی دولت و ثروت اور اُن کی علم پروری اور کمال نوازی کا شہرہ سُن کر ایران کے ہر فن کے اصحاب کمال کھنچ کر ہندوستان مین جمع ہوگئے تھے، اور وہ شیراز و اصفہان کا خطہ بن گیا تھا، ان دونون کے میل جول، اور ایرانی و ہندوستانی تمدن کے اختلاط سے ایک ایسی دلکش و دلفریب تہذیب پیدا ہوئی جس کی زمین تو ہندوستانی تھی، مگر اُس کے گل بوٹے، اور آب و رنگ ایرانی تھا یہی دلکش تہذیب ہندوستان کی معیاری تہذیب قرار پائی، اس کے اثرات اتنے گہرے ہین کہ مٹائے نہین مٹ سکتے، اور وہ زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ع ؎ ثبت است بر جریدۂ بجارت دوام ما

ایران کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکون کے ساتھ بھی ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کے تعلقات رہے، اُن کے بھی کچھ نہ کچھ اثرات ہندوستان پر پڑے اور آج بھی ہندوستان مین چار کروڑ مسلمان موجود ہین، جن کا کچھ نہ کچھ مذہبی اور تمدنی

رشتہ اسلامی ملکون سے رہے گا، اس طرح ہندوستان اور اسلامی ملکون کے درمیان صدیون سے تعلق چلا آرہا
ہندوستان کو اسلامی ملکون کے ساتھ سیاسی اور کلچرل تعلقات کے جو مواقع اور سہولتین حاصل ہین، وہ کسی دوسرے
ملک کو نہین ہین، اور آج ساری دنیا کے مسائل اس قدر مشترک، اور مختلف قومون اور ملکون کے مفاد و مصا
ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہین کہ ہر ملک دوسرے ملکون سے تعلقات پیدا کرنے پر مجبور ہی،

خود یورپ نے جس کو اسلامی ملکون سے اتنا قریبی تعلق نہین ہی، جتنا ہندوستان کو ہی، ان سے تعلقات
کرنے کے لئے کتنی کوششین کین، اُن کی زبانین اور اُن کے علوم سیکھے، اُن کے مذہب اور اُن کے تمدن کا مطالعہ کی
اور اُن سب سے فائدہ اٹھایا، ان پر تحقیقات کی کتابین لکھین اور اس سلسلہ مین اسلامی علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام
دی، اس کے مقابلہ مین ہندوستان جس کو اسلامی ملکون سے تعلقات بڑھانے کے بہت زیادہ وسائل و مواقع حاصل
ہین، اپنی تنگ دلی اور تنگ نظری سے اُن کو کھو رہا ہی اور ہندوستان سے اسلامی اثرات کو مٹا کر اسلامی ملکون
تعلقات پیدا کرنے کے وسائل کو کمزور کر رہا ہے،

یہ کھلی ہوئی بات ہی کہ اسلامی دنیا خالص ہندو تہذیب کے مقابلہ مین اُس تہذیب سے جس مین ہندوستانی اور اسلامی
دونون اثرات ہون اور خالص ہندی اور سنسکرت کے مقابلہ مین اس زبان سے جس مین ہندی کے ساتھ عربی فارسی
ترکی کے بھی الفاظ ہون زیادہ مانوس ہو گی اس لئے کہ خالص ہندو تہذیب اور ہندی اور سنسکرت زبانین اس کے لئے
اجنبی ہین، اور ہندوستان کی مشترک تہذیب اور مشترک زبان مین اس کو اپنی تہذیب اور اپنی زبان کے بھی اجزا
آئین گے، اس لئے ہندوستان کے لسانی اور تمدنی مسئلہ پر اس حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہی قومیت
کا یہ تصور ہی غلط ہی کہ صرف اپنی قدیم وطنی اور ملکی چیزون کو خواہ وہ دورِ وحشت ہی کی یادگار کیون نہ ہون باقی
باقی ان تمام چیزون کو جن مین بیرونی اثرات کا ذرا سا بھی شائبہ ہو خواہ وہ کتنی ہی مفید ہون مٹا دیا جائے
وطنیت کا یہ تصور تو یورپ مین بھی نہین ہی جہان کی وہ پیداوار ہین اگر یورپ بھی اس پر عمل کرتا اور قرون
زندہ کرنے کی کوشش کرتا تو اب تک دورِ جہالت سے باہر قدم نہ نکال سکتا، اسلئے اس قسم کے مسائل پر تعصب
قدامت پرستی کے دائرہ سے ہٹ کر ملک کے حالات اور ملک کی صلاح و فلاح اور ترقی کے نقطۂ نظر سے غور کرنیکی ضرورت ہی

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون

کے عہد مین

فوجی قیامگاہون کے ساز و سامان

از

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے

ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤن کے زمانہ مین شاہی فوج جب میدانِ جنگ کو جاتی تھی، تو
بہت آراستہ و پیراستہ ہو کر، ان کی حکومت اس سرزمین مین جتنی زیادہ مستحکم ہوتی گئی اتنی ہی اُن کی فوج کی شان
و شوکت مین اضافہ ہوتا گیا، تیموری عہد سے پہلے کے مورخون نے تو اپنے عہد کی فوجی شان و شوکت کی
تفصیل بیان کرنے مین بخل سے کام لیا ہے، لیکن اس مین ذرا بھی شک و شبہہ کی گنجائش نہین کہ اس دور کے
لشکریون کی کارکردگی اور نبرد آزمائی تیموری عہد کی فوج سے کسی لحاظ سے بھی فروتر نہین تھی، اگر اس دور
مین بھی کوئی ابوالفضل یا عبدالحمید لاہوری یا کاظم شیرازی ہوتا، تو اس زمانہ کے فوجی کارنامے بھی تیموری عہد
ہی کی طرح پر شکوہ معلوم ہوتے، لیکن اس دور کے مورخون کی خاموشی کے باوجود سلاطینِ دہلی کے فوجی دبدبے
کا جو غلغلہ بیرونی ممالک مین بلند ہوتا رہا، اس کو وہان کے بعض اہلِ قلم نے بڑے ولولہ انگیز طریقے پر لکھا ہی
چنانچہ صبح الاعشیٰ کے مصنف کا بیان ہی کہ سلطان محمد تغلق جب کسی فوجی مہم پر روانہ ہوتا تھا، تو بڑے تزک و احتشام

سر دراز ہوتا تھا، ایک سوار تاج شاہی پر چتر لگائے رہتا تھا، سلاح دار زرق برق لباس میں ملبوس چمکیلے
ہتھیار سنبھالے ہوئے سواروں کے پیچھے ہوتے تھے، تقریباً بارہ ہزار خدام پا پیادہ رہتے تھے، سواری
کے آگے طبل بجایا جاتا تھا، طبل میں ۲۰۰ نقارے، ۴۰ کوس، ۲۰ بوق اور ۱۰ چنگ ہوتے تھے، سلطان
کے ساتھ دوسرے اعیانِ سلطنت اپنے اپنے امتیازی جھنڈوں کے ساتھ ہمرکاب ہوتے تھے، بعض
خوانین کو سات سات جھنڈے رکھنے کی اجازت ہوتی تھی، اعیانِ حکومت کے چند دوسرے امتیازات خصوصی
بھی ہوتے تھے، مثلاً خوانین عام طور پر دس کوتل گھوڑے اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے اور امراء کو ۳۰ کوتل گھوڑوں کی اجازت ہوتی تھی؛

لشکر کوچ کرتا تو ہاتھیوں، سواروں، اونٹوں، پیادوں، بار برداری کے جانوروں، بیلداروں،
نجاروں اور لوہاروں اور بنجاروں وغیرہ کی ٹولیاں علیحدہ علیحدہ ہوتی تھیں، اور خاص فوجی تنظیم کے
ساتھ آگے بڑھتی تھیں، پڑاؤ کے لئے بڑے بڑے خیمے ساتھ ہوتے، ابن بطوطہ نے تغلق کے عہد کے خیموں کے
دو نام لکھے ہیں (۱) سراچہ اور صیوان شاہی سراچہ کا رنگ سرخ اور امراء کے سراچہ کا رنگ سفید
ہوتا تھا جس پر نیلے رنگ کا نقش بھی ہوتا، صیوان سراچہ کے اندر سایہ کے لئے لگایا جاتا تھا، جو دو بڑے
بانسوں پر کھڑا رہتا تھا[۵۲]، فیروز شاہ کے خاص خاص خیموں کے نام یہ تھے، دہلیز، بارگاہ، خوابگاہ،
فیروز شاہ کی ایک ایجاد گنبد سفید بھی تھا، جو بارگاہ کے ساتھ نصب کیا جاتا تھا جس کے نیچے وہ پوری
شان و شوکت کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا[۵۳]،

جب خیمے پڑاؤ پر نصب کئے جاتے تو ان کی ترتیب میدانِ جنگ ہی کی طرح دی
جاتی تھی یعنی آگے تو مختلف قسم کی فوجوں کے خیمے ہوتے، بیچ میں بادشاہ، فوج کے اعلیٰ عہدیداروں اور حرم کی
عورتوں کے خیمے ہوتے، ان کے پیچھے اسلحہ خانہ، بار برداری کے جانور اور فوج کے دوسرے متعلقات ہوتے

---

۵۱ صبح الاعشیٰ ترجمہ معارف نمبر ۶ جلد ۲۶ ص ۴۴۲ ۵۲ سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۲۴ ۵۳ تاریخ
فیروز شاہی از شمس سراج عفیف

اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا، کہ فوج کی پشت پر حفاظت کے لئے یا تو پہاڑی ہو یا ندی، اور اگر اس قسم
کی حفاظت کا فطری سامان نہ ہوتا، تو خندقیں کھود دی جاتیں، یا خاردار شاخوں کی باڑھ لگا دی جاتی

تیموری دور کے فوجی کیمپ کے ساز و سامان کی بہت واضح تفصیلات ملتی ہیں، اکبر کے زمانہ میں یہ
دستور تھا کہ فوج کے ٹھہرنے کی جگہ میر منزل منتخب کرتا، یہ جگہ ۱۵۳۰ گز لمبی ہوتی، اُس کے اگلے
حصہ میں قول کی فوج ٹھہرتی، اور دائیں بائیں بازو میں جرانغار اور برانغار کا لشکر ہوتا، قول کے پیچھے
اکبر کے محل کی بوڑھی عورتوں (مثلاً مریم مکانی، گلبدن بیگم وغیرہ) کی قیامگاہ ہوتی، اس کے بعد قنات
کا ایک حصار بنایا جاتا، اس کو گلال بار کہا جاتا تھا، جو سو گز مربع ہوتا تھا، اس حصار کے اندر شرقی جانب داخل
ہونے کے لئے دو خیمے ہوتے، جو سرغہ کہلاتے تھے، ان میں ۵۴ خانے ہوتے تھے، ان دو خیموں کے بعد ایک بڑی
چوبین راوٹی ہوتی تھی جس کے گرد سراپردہ ہوتا، اس کی چوبین راوٹی سے متصل ایک دو منزلہ خیمہ کھڑا
کیا جاتا، جہاں بادشاہ عبادت کرتا، اور صبح کو امراء کا مجرا قبول کرتا، اس چوبین راوٹی کے بعد چوبیس
راوٹیاں اور کھڑی کی جاتیں، ان میں سے ہر ایک دس گز لمبی اور چھ گز چوڑی ہوتی، یہ بیگمات کے لئے مخصوص
ہوتیں، یہ حصہ شبستانِ اقبال کہلاتا تھا، اس کی بعض راوٹیاں زربفت اور مخمل سے تیار کی جاتی تھیں،
اسی سے متصل کنیزوں اور دوسری عورتوں کے لئے بھی راوٹیاں ہوتیں، شبستان اقبال کے باہر ایک
چوڑا صحن چھوڑ دیا جاتا، جو مہتابی کہلاتا، اس صحن کے وسط میں ایک چبوترہ بنایا جاتا، جس پر ایک نمگیرہ
سایہ فگن رہتا، شام کے وقت بادشاہ اپنے مخصوص امراء کے ساتھ یہاں بیٹھتا، اس کے بعد دولتخانہ
خاص کا خیمہ ہوتا جو بارگاہ کہلاتا، اس کو ہزار فراش ایستادہ کرتے تھے، اس میں بہتر کمرے ہوتے،
اور اس کے گرد پچاس شامیانے کھڑے کئے جاتے تھے، اس حصہ کو مختلف رنگ کے قالینوں سے
ایسا سجایا جاتا کہ ایک کھلا ہوا چمنستان معلوم ہوتا، یہ دیوان خاص کہلاتا، جہاں امراء مشورے کیلئے
بلائے جاتے، اس سے ساڑھے تین سو گز کے فاصلہ پر ایک دوسرا خیمہ ہوتا، جو دیوان عام کہلاتا تھا، اسی کے

سامنے اکاس دیا روشن رہتا،

پھاٹک پر نقار خانہ ہوتا، اس کے دائین اور بائین جانب زین خانہ اور دفتر خانہ رہتا تھا، زین خانہ کے سامنے اصطبل دار وغہ اسپان اور مشرف اصطبل و فیل خانہ کی جگہ ہوتی، اسی طرح دفتر خانہ کے سامنے نگہ بان، توپخانہ اور جبہ خانہ کے لئے جگہین مخصوص ہوتین، حصار کے بیرونی حصہ کے دائین اور بائین جانب اور پشت پر تین تین سو گز کے قطعے چھوڑ دیئے جاتے تھے، جن مین شہزادون کے خیمے نصب کئے جاتے تھے، شاہی خیمہ کی پشت پر توشہ خانہ اور محافظون کا دستہ تعینات رہتا، اور اس سے متصل اکبر کے محل کی بوڑھی عورتین مثلاً مریم مکانی، اور گلبدن بیگم وغیرہ کے خیمے لگائے جاتے، جس کے آگے قول کی فوج ہوتی، حصار کے بیرونی حصہ کے دائین جانب یعنی شہزادون اور امراء کے خیمون سے متصل روزانہ کی ضروریات کے سامان مثلاً مشعل خانہ، چراغ خانہ، توشک خانہ، خوشبو خانہ، آفتابچی خانہ وغیرہ کے علحدہ علحدہ چھوٹے چھوٹے خیمے ہوتے، اسی کے بغل مین جرانغار کی فوج ہوتی، اسی طرح حصار کے بیرونی حصے کے بائین جانب آبدار خانہ، شربت خانہ، تنبول خانہ، میوہ خانہ، رکاب خانہ، مطبخ، حوائج خانہ وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے خیمے ہوتے، اور اسی کے بغل مین جرانغار کی فوج ہوتی، حصار کے چھ گوشون پر پہرہ دار تعینات رہتے، اور حصار کے تیس گز کے فاصلے پر چارون کونے پر بازار لگائے جاتے، بازار کے چارون طرف اراکین دربار اپنے اپنے عہدون کے مطابق قیام پذیر ہوتے تھے،[1]

کیمپ کے ساز وسامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے مین سو ہاتھیون، پانچ سو اونٹون، چار سو عرابے (گاڑیان) اور ایک سو کہارون کی ضرورت ہوتی تھی، پانچ سو منصبدار اور احدی ان کے جلو مین رہتے تھے، ان کے علاوہ ایک ہزار ایرانی، تورانی، اور ہندی فراش، پانچ سو بیلدار، سو سقے، پچاس بڑھئی، خیمہ دوز، مشعلچی، تیس موچی، اور ڈیڑھ سو خاکروب بھی ساتھ ہوتے تھے،[2]

[1] تفصیل کے لئے دیکھو آئین اکبری، متعلقہ ص ۴۰، نولکشور پریس اڈیشن و آئین ۱۶، ۱۷ [2] ایضاً ص ۱۲۶

ضرورت کے مطابق اُن کی تعداد بڑھتی بھی رہتی تھی،

اورنگزیب کے ایک ہم عصر فرانسیسی مورخ نے اس کی ایک فوج کے کوچ کرتے وقت کے ساز وسامان کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:-

"بڑی بڑی توپین پہلے بھیجی گئین، یہ گویا ہراول کا دستہ تھا، اس کے پیچھے ساز وسامان ترتیب کے ساتھ روانہ کیا گیا، پہلے اونٹون کی قطار تھی، جن پر شاہی خزانہ لدا تھا، سو اونٹون پر سونا، اور دوسو پر چاندی کے سکے تھے، ہر اونٹ پر پانچ سو پونڈ سے زیادہ کا بوجھ نہ تھا، اونٹون کے پیچھے شکاری کتے تھے، یہ ہرنون اور چیتون کے شکار کے لئے ساتھ رکھے گئے تھے، اُن کے بعد اسّی اونٹون، تیس ہاتھیون، اور بیس گاڑیون پر سرکاری کاغذات بار تھے، مغل بادشاہون کا دستور تھا کہ وہ ضروری کاغذات کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، ٹھیک اس قطار کے بعد پچاس اونٹون پر بادشاہ اور شہزادون کے پینے کے لئے پانی تھا، ان اونٹون کے پیچھے اونٹون پر شاہی مطبخ کا سامان تھا، دودھ کے لئے پچاس گائین بھی ساتھ تھین، کیونکہ اورنگزیب زیادہ تر دودھ ہی استعمال کرتا تھا، ایک سو باورچی پیچھے پیچھے گھوڑون پر سوار تھے، ہر باورچی علحدہ قسم کا کھانا پکاتا تھا، اس کے بعد بادشاہ اور حرم کی بیگمات کے لباس وپوشاک کا ساز وسامان تھا، جو پچاس اونٹون اور ایک سو گاڑیون پر بار تھا، تیس ہاتھیون پر بیگمات کے جواہرات، خنجر اور شمشیرین تھین، یہ خنجر اور شمشیر بادشاہ اپنے فوجی افسرون کو تحفہ دیا کرتا تھا، توپون کے آگے آگے دوسو بیلدار راستون کو ہموار کرنے کے لئے تھے، اونٹون اور ہاتھیون کے چلنے سے راستے مین جو ناہمواری پیدا ہو جاتی تھی، اُس کے لئے ایک ہزار بیلدار علحدہ تھے، ساز وسامان کے پیچھے سوارون کا دستہ تھا، سوارون کے بعد بادشاہ کی سواری تھی، جو زیادہ تر ہاتھی پر سفر کرتا تھا، ہاتھی کے ہودج پر ایک کمرہ بنا تھا، جس مین شیشہ کی کھڑکیان تھین، اور آرام کرنے کے لئے

ایک پلنگ بھی تھا، ہاتھی کے ساتھ ساتھ پالکیاں بھی تھیں، تاکہ جب بادشاہ کا دل چاہے ان پر بھی سفر کر سکے، ہاتھی کے پیچھے بادشاہ کی سواری کے لئے کچھ گھوڑے بھی ساتھ ساتھ تھے، کیونکہ اورنگزیب شہسواری کا بہت شایق تھا، اور بڑھاپے میں بھی اپنی سلطنت کا سب سے بہتر شہسوار سمجھا جاتا تھا، بادشاہ کے ہاتھی کے آگے کچھ اونٹ تھے، جن پر انگیٹھیاں رکھی تھیں، اُن میں خوشبودار مسالے جلا کر فضا معطر کی جاتی تھی، تاکہ بادشاہ کے سفر کا راستہ معطر رہے، اُس کی سواری کے دونوں بازوؤں پر شاہی محافظوں کے دستے تھے، شاہی سواری کے پیچھے حرم کی بیگمات تھیں، ہاتھی پر اُن کے ہودج ایسے باریک ململ سے ڈھکے تھے کہ وہ باہر کی سب چیزیں دیکھ سکتی تھیں لیکن اُن پر کسی کی نظر نہیں پڑتی تھی، حرم کی برقعہ پوش خادمائیں گھوڑوں پر پیچھے پیچھے تھیں، عقب میں بکثرت آدمی تھے، اُن میں کچھ تو ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں سے متعلق خدمت گذار، کچھ خیمہ بردار، کچھ فوجی عہدیداروں کے غلام و چاکر تھے، لیکن یہ بھی فوجی تنظیم کے ساتھ قطاروں میں آگے بڑھتے تھے،[۵۱]

رسد کی فراہمی اگر فوج دار السلطنت سے قریب ہی کسی مہم پر ہوتی، تو لشکریوں کے خورد و نوش کا سامان دار السلطنت سے بھیجا جاتا تھا، اور اگر دور دراز مقام پر ہوتی، تو لشکر کے قریب بنجارے اور سوداگر چلتے جن کے لئے ضیاء الدین برنی نے کاروانیان کی اصطلاح استعمال کی ہے،[۵۲] یہ سوداگر غلے وغیرہ کی دکانیں فوجی کیمپ کے اردگرد لگاتے تھے، کبھی آس پاس کے علاقے کے مقطع یا جاگیردار یا ریاستیں بھی فوجی رسد ارزان قیمت پر فراہم کیا کرتی تھیں،[۵۳] کبھی مفتوحہ علاقہ سے مالِ غنیمت کے طور پر غلہ حاصل ہو جاتا تھا جو پورے لشکر میں تقسیم کر دیا جاتا تھا،

علاء الدین خلجی نے تو سپاہیوں کو ارزان قیمت پر اجناس فراہم کرنے کیلئے باضابطہ قوانین جاری کئے تھے اور اس کے عہد

---

[۵۱] آرمی آف دی انڈین مغلس از ولیم اروِن ص ۵-۲۰۳ [۵۲] برنی ص ۳۰۴ و ۳۰۵ [۵۳] ایضاً ص ۳۲۸،

میں ہر جگہ فوجیوں کو سستی چیزیں مل جاتی تھیں، مثلاً ایک لشکری ساڑھے سات جیتل میں ایک من گیہوں، چار جیتل میں ایک من جو، پانچ جیتل میں ایک من چنا، پانچ جیتل میں ایک من ماش خرید سکتا تھا[۵۴]

تیمور جب اپنی فوج لے کر ہندوستان آیا تھا، تو پہلے آس پاس کے علاقے سے غلہ کا ذخیرہ جمع کر لیتا تب لڑائی چھیڑتا، یا کسی قلعہ کا محاصرہ کرتا،[۵۵] تو جب تیموریوں کی باضابطہ سلطنت قائم ہو گئی، تو اُن کے فوجی کیمپ کے ساتھ سفری بازار ہوتا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، اس بازار میں بنیے اپنی دوکانیں لگاتے اور بنجارے باہر سے غلہ لاتے،[۵۶] کبھی دار السلطنت سے غلہ بھیجا جاتا،[۵۷] کبھی خورد و نوش کا سامان لشکریوں کے ساتھ ہوتا،[۵۸] ہر سپاہی چار روز کا آذوقہ ساتھ رکھتا تھا،[۵۹] کبھی اردگرد کے علاقہ سے بھی فراہم کر لیا جاتا، اور فوج کی روانگی کے وقت اس کا ضرور لحاظ رکھا جاتا کہ آس پاس کے علاقہ سے غلہ آسانی سے فراہم ہو جائے گا، ورنہ مہم ملتوی رہتی،[۶۰]

اگر رسد کی فراہمی کا معقول انتظام نہ ہوتا تو فوج ہلاکت[۶۱] مصیبت میں مبتلا ہو جاتی، بختیار خلجی جب لکھنوتی سے تبت کی مہم پر روانہ ہوا، اور راہ کی دشواری کی وجہ سے اس کو لوٹنا پڑا، تو واپسی میں دشمنوں نے راستے کے تمام علاقہ کو اس طرح جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا کہ اس کے لشکریوں اور گھوڑوں کو کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہیں مل سکی، اس لئے مجبوراً لشکریوں نے گھوڑوں کو ذبح کر کے کھانا شروع کیا،[۶۲] فیروز شاہ تغلق ٹھٹھ کی پہلی مہم میں محض اس لئے ناکام رہا تھا، کہ اُس کی فوج میں غلہ کی کمی ہو گئی، اور اس کا نرخ ایک ٹنکہ یا دو ٹنکہ فی سیر ہو گیا تھا، اور لشکری مردار جانوروں کا گوشت کھانے، اور کچے

---

[۵۴] تفصیل کے لئے دیکھو برنی ص ۳۰۵ [۵۵] ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ص ۴۳۴ [۵۶] اکبرنامہ جلد دوم ص ۳۶، و اقبال نامہ جہانگیری (اردو ص ۱۱۱) [۵۷] بدایونی جلد دوم ص ۳۴۹، ۳۲۰ [۵۸] ایضاً ص ۱۸۲ [۵۹] سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۷۵ [۶۰] بادشاہ نامہ جلد ا ص ۱۳۴۱، و ج ۲ ص ۴۵۷ [۶۱] طبقات ناصری ص ۱۵۳)

چمڑے کو پانی میں جوش دے کر شکم پری کرنے کے لئے مجبور ہوگئے تھے، اس پر بھی لشکر کے زیادہ تر سپاہیوں کی جانیں فاقے سے تلف ہوگئیں، خود شاہی خاندان کے افراد نے کھچڑی کھا کر جان بچائی[۱]

ہمایوں اور سلطان بہادر گجراتی سے جب مانڈو میں جنگ ہوئی، تو سلطان بہادر توپوں کا ایک مستحکم مورچہ بنا کر ہمایوں سے دو مہینے تک لڑتا رہا، مگر آخر میں ہمایوں نے سلطان بہادر کی فوج کے رسد پہنچنے کے تمام راستوں کی اس طرح ناکہ بندی کر دی کہ سپاہیوں کے لئے غلہ، ایندھن، اور جانوروں کیلئے چارہ پہنچنا مشکل ہوگیا جس سے سلطان بہادر کی فوج میں قحط کے ساتھ وبا بھی پھیل گئی، اور بے شمار لشکریوں اور جانوروں کی جانیں تلف ہونے لگیں، یہاں تک کہ سلطان بہادر لشکر کو چھوڑ کر فرار ہوگیا[۲]

اکبر کے ۳۰ ویں سال جلوس میں شاہی فوج جانی بیگ کے خلاف بھیجی گئی، تو رسد کی بڑی کمی ہوگئی جس سے ساری فوج کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی، اور شاہی فوج کے دستے ادھر ادھر جا کر باضابطہ جنگ کرتے تو کھانے پینے کی کچھ چیزیں مل جاتیں[۳]

۴۵ ویں سال جلوس میں اکبر کی فوج نے جب قلعہ اسیر کا محاصرہ کیا، تو محصورین کے لئے غلہ لئے جانے کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاقہ اور وبا سے چالیس ہزار محصورین موت کے گھاٹ اتر گئے[۴] شاہجہان کے زمانہ میں جب اورنگ زیب بلخ کی مہم پر گیا، تو اثنائے جنگ میں غذا کی ایسی قلت ہوگئی کہ ایک ایک روٹی دو دو روپیے میں بکنے لگی تھی، اس پر بھی کسی کو ملتی، اور کسی کو نہیں ملتی، مگر اورنگ زیب نے اپنی غیر معمولی مستقل مزاجی، ہمت اور بردوت سے کام لے کر فوج کو ہمت ہارنے سے بچائے رکھا[۵]

سفری اسپتال ہر لشکر کے ساتھ زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کے لئے ضروری سامان بھی ہوتا، اور اس کا

[۱] تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف۔ [۲] طبقات اکبری ص ۳۲، ۳۳، ۵۳ [۳] اکبر نامہ جلد سوم ص ۔ [۴] ایضاً ص ۷۸۰ [۵] خافی خان جلد اول ص ۶۶۳ – ۶۶۶،

اہتمام ہر دور میں رہا، غیاث الدین تغلق جب اپنے حریف اور تخت دہلی کے دعویدار خسرو خان پر غالب آیا، تو موحمد اللہ کرکے بہت سے سپاہی اور سردار میدان جنگ میں اس کے سامنے پیش کئے گئے، ان کے ساتھ وہ بہت لطف وکرم سے پیش آیا، زخمیوں کی مزاج پرسی کرکے ان کی ہمت بڑھائی، ان کے علاج معالجہ کا انتظام کیا، اور بعض سرداروں کی خود تیمارداری کی ان ہی میں ایک سردار تمر تھا جس کو غیاث الدین تغلق کے سپاہی قتل کر دینا چاہتے تھے، لیکن خود غیاث الدین تغلق نے اس کو بچا لیا، اور اپنے ہاتھ سے اس کے زخموں میں ٹانکے دیئے، دوا ٹپکائی، اور اس کی برابر خبرگیری کرتا رہا، چنانچہ امیر خسرو تغلق نامہ میں فرماتے ہیں :-

بدست خود جراحت ہاش می بست دوا ہا بہر راحت ہاش نی بست
بتکیہ پیش خویشش داشت معذور وے از تکیہ گاہ او نہ شد دور
دلش داد و بجان بخشیش جان داد ازیں بہ بخششے خود چون توان داد
بریشان دیگران را نیز بسیار نوازش کرد بیش از قدر و مقدار

چو ہر مجروح را مرہم رسانید
دوائے جان ہر در ہم رسانید[۱]

اکبری عہد میں منعم خان خانخاناں شاہی لشکر لے کر داؤد خان کے خلاف سرکوبی کے لئے اڑیسہ گیا، تو بجھورا میں ایک بڑا معرکہ ہوا، اور شاہی لشکر کے سپاہی زخمی ہوئے، تو ان کے علاج معالجہ کے لئے خانخاناں کو وہاں کچھ دنوں ٹھہرنا پڑا، منتخب التواریخ میں ہے،

"خانخاناں دراں منزل چند روزے توقف نمودہ بداوائے جراحت خود و سائر مجروحان پرداخت" (جلد دوم ص ۱۹۶)

[۱] تغلق نامہ ص ۱۰۲، مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی،

سموگڈھ کی لڑائی مین شہزادہ مراد دارا کے خلاف بڑی دلیری اور پامردی سے لڑا تھا، اس کے جسم اور چہرہ پر بہت سے کاری زخم لگے تھے. لڑائی ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب اس کے پاس گیا، اور بڑی شفقت سے پیش آیا، میدان جنگ مین فوراً ہر جراحون کو طلب کرکے علاج معالجہ کا سامان کیا، منتخب اللباب مین ہے،

"چون بربدن و چہرہ محمد مراد بخش زخمہاے تیر بسیار رسیدہ بود برہم لطف و دلداری ظاہر کوشیدہ جراحان چابکدست را حاضر ساختہ، مراد برزانوے شفقت خود گذاشتہ بعلاج زخمہا پرداختند، (جلد دوم ص ۲۹)

مقدمہ رقعات عالمگیر

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء، اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، اور ہندوستان کے صیغہ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء، اور اس کی تاریخ کے ماخذ، عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات وحالات پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے، مرتبہ سید نجیب اشرف صاحب پروفیسر اسماعیل کالج بمبئی،

قیمت :- صہ ر

"منیجر"

گجرات کا بحری بیڑا

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی

(۲)

اسلامی عہد مین گجراتی بیڑے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے جو جہاز تیار ہوا، وہ بحر عرب کے مقام بحرین مین ہوا، بحرین سمندر مین ہونے کے سبب سے جہاز سازی اور جہاز رانی دونون کے لئے بہت موزون جگہ ہے، عربون کا سب سے پہلا جہاز بحر عرب مین ۱۵ھ ۶۳۶ء مین بحرین سے روانہ ہوکر تھانہ پہنچا، اور پھر دوسرا بھروچ، اور تیسرا دیول، اس کے بعد تو تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ، جہاز رانی بھی بڑھتی گئی، پہلی صدی ہجری کے اختتام پر عربون کے جہاز لنکا، جاوہ، اور چین تک جانے لگے، چنانچہ ان ہی مین حاجیون کے وہ جہاز تھے، جن کو دیول کے پاس بحری قزاقون نے لوٹ لیا تھا، اور لوٹ کا مال اور عورتون کو واپس کرنے سے انکار پر محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کرکے اس کو فتح کر لیا، دوسری صدی ہجری کے آخر مین عربون کی تجارت بحر عرب مین بہت ترقی کر گئی تھی، تمام بڑے بڑے گجراتی بندر عربون کے جہازون سے بھرے رہتے تھے،

یوگ راج چاوڑا کے عہد (۱۹۱ھ ۸۰۶ء) مین شیم راج نے سومناتھ کے بندر پر عربون کے جن جہازون کو لوٹا تھا، اس مین دس ہزار گھوڑے اور ہاتھی کے علاوہ لاکھون کا مال تھا[1]، اس سے تجارتی ترقی کا اندازہ

---

[1] رتن الابیان خاندان چاوڑا، ان گھوڑون کی قیمت سترہ لاکھ ساٹھ ہزار روپیے تھی، اسی سے ہاتھی اور دوسرے مال کا اندازہ آپ لگا سکتے ہین،

لگا سکتے ہین،

ساتوین صدی کے آخر تک عربون کی بحری تجارت کو اس قدر فروغ ہوا کہ گجرات کا کوئی بندر اُن کے مال سے خالی نہ ہوتا تھا، اور عرب تاجر، اہل ملک (گجراتی) اور ملک کا راجہ سب کے سب اُس سے فائدہ اٹھاتے تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربون کی جہازرانی نے گجراتی بیڑے کو بیکار کر دیا تھا کیونکہ کتابون مین گجراتی جہازون کا کوئی ذکر نہین آتا ہے، ہر جگہ عرب ہی کے جہازون کا ذکر ملتا ہے، راشٹر کوٹ کے زمانہ مین راجہ، عرب تاجرون کی بڑی قدر کرتا تھا، جیسا کہ سلیمان بصری اور ابوالحسن زید سیرافی اور مسعودی کے سفرنامون سے معلوم ہوتا ہے، اس کا سبب صرف یہ تھا کہ تجارتی مال سے جو محصول لیا جاتا اس سے راجاؤن کو بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی، ساتوین صدی کے آخر مین سولنکی اور باگھیلا خاندان نے جہازون کی جانب توجہ کی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربون کی مدد سے ایک بیڑا تیار کر لیا تھا، چنانچہ ارجن باگھیلہ کا امیر البحر ایک عرب تھا، خلجی اور تغلق کے زمانہ مین تجارتی جہازون کی آمد و رفت اس سبب سے بہت تھی کہ مسلمان عرب اور ایرانی بڑی تعداد مین راشٹر کوٹ کے عہد سے تمام گجراتی بندرون مین بس گئے تھے، مسعودی نے لکھا ہے کہ چیمور مین دس ہزار گھر عربون اور ایرانی لوگون کے ہین، جو تقریباً سب کے سب تاجر ہین، یا تجارتی تعلقات سے وابستہ ہین، یہی حال دوسرے بندرون کھنبایت، بھروچ، سومناتھ، جوناگڈھ وغیرہ کا تھا، سدھ راج کے زمانہ مین کھنبایت مین پارسیون کے بھڑکانے سے ہندوؤن نے جو بلوہ کیا، جس مین بہت سے عرب قتل ہوئے تھے، اور اُن کی جامع مسجد گرا دی گئی تھی،[1] اس سے اُن کی آبادی کا پتہ چلتا ہے،

غرض خلجی اور تغلق کے عہد مین بھی عرب اور ایرانی نوآباد تاجر تھے، جن کے جہاز ذاتی یا مشترکہ کمپنی کے طور پر چلتے تھے، ممکن ہے دو چار سرکاری جہاز بھی ہون لیکن کسی تجارتی، مسافری جہاز یا جنگی بیڑے کا پتہ ابھی

[1] جامع الحکایات قلمی (دار المصنفین اعظم گڈھ)،

تک کتابون سے نہین چلا، ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تمام جہاز ان ہی آبادشدہ یا غیر ملکی تاجرون کے تھے، البتہ بعض بعض مقامی زمیندارون کے پاس بھی اپنے جہاز ہوتے تھے، وہ لنکا اور مدراس کے سمندر مین اور مالابار کے ساحل پر چینی جہازون کا بھی ذکر کرتا ہے، تجارت مین تو ہندی بنیا بھی شامل تھا، جو لاکھون کا نفع اٹھاتا تھا، مگر جہاز کسی کے پاس نظر نہین آتا، اگر کسی گجراتی غیر مسلم کے پاس اتفاقاً کوئی جہاز ہو تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے، جیسا کہ گجرات تو وہان دٹو مین کسی بنیے کے پاس متعدد جہاز کا ہونے کا بیان ہے لیکن یہ صرف ایک ہی مثال ہے،

گجراتی سلاطین مین سب سے پہلا شخص سلطان احمد اول ہے، جس نے سرکاری طور پر جہازون کا بندوبست کیا، [illegible] مین سلطان بہمنی کے سپہ سالار ملک التجار حسن بصری نے مہائم کا علاقہ فتح کر لیا، جو گجرات کے ماتحت تھا، سلطان نے مخلص الملک حاکم دیو کو بحری بیڑہ روانہ کرنے کا حکم بھیجا، چنانچہ وہ سومناتھ، گھوگھہ اور کھنبایت سے سترہ جہازون کا بیڑا لے کر مہائم روانہ ہوا، اور کامیاب واپس آیا،[1] اس سے معلوم ہوا کہ ان تین بندرگاہون مین جہازی بیڑا ہر وقت تیار رہتا تھا، گجرات کا یہ گویا پہلا اسلامی گجراتی بیڑا ہے، جس نے سمندر مین حرکت کی، سلطان محمد اول اور سلطان قطب الدین کو خشکی کی مہمون سے فرصت نہین ملی، اس لئے وہ اس طرف توجہ نہ کر سکے لیکن سلطان محمود اول (بیگڑا) کو اس معاملہ مین خاص دلچسپی تھی، اور بعض ترکی امیر البحر کی آمد نے اس مین بہت زیادہ اضافہ کر دیا، اور اس عہد مین گجراتی بیڑا بہت مضبوط ہو گیا، سندھ کے ساحل سے لے کر ڈابھول بندر کے ساحل تک یہ بیڑا حفاظت کرتا تھا، ترکون کے اثر سے سلطان محمود نے بھی جنگی جہازون پر توپین چڑھائین، اور اُن کو ترکی طریقے پر مسلح کیا، [illegible] مین سلطان محمد بہمنی نے اپنے وزیر خواجہ جہان محمود کو قتل کر ڈالا، اور چند دنون کے بعد وہ خود بھی وفات پا گیا، مرکزی سلطنت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بہادر گیلانی نے ساحلی مقامات پر قبضہ کر لیا، اور

[1] فرشتہ بیان احمد شاہ اول گجراتی،

جہازون کا بیڑا تیار کرکے بحری قزاقی پر آمادہ ہوگیا، اور دکن سے گجراتی بندرون پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا، ایسے گجراتی تجارتی جہاز لوٹ لئے[51] اور قریب قریب تمام گجراتی بندرون سے آمد ورفت بند ہوگئی، اور ضروری چیزین جو باہر سے آتی تھین، اُن کے نہ آنے سے ملک مین پریشانی ہوگئی، ڈلی کی درآمد بند ہوجانے سے لوگون نے اسکی جگہ دھنیا استعمال کرنا شروع کردی، سلطان محمود کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے تین سو جنگی جہاز، توپون سے مسلح ڈابھول بندر پر حملہ کرنے اور بہادر گیلانی کو گرفتار کرنے کے لئے روانہ کئے[52]، اس سے اس کی بحری طاقت کا اندازہ ہوسکتا ہے، اس کے عہد مین امیر البحر ملک طوغان اور پھر ملک ایاز تھا، یہ دونون بہترین قابلیت کے امیر تھے، اور اُن کو سمندر کا خاص تجربہ اور جہازون کے متعلق بڑی واقفیت تھی، اس کی انتظامی قابلیت بھی بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی، ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء مین سلطان محمود کو معلوم ہوا کہ پرتگیز بڑی تعداد مین آگئے ہین، اور کسی ساحلی مقام پر قبضہ کرکے قلعہ بنانا چاہتے ہین، اُس نے امیر البحر ایاز کو ان سے بحری جنگ کرنے کا حکم دیا، چنانچہ دیو، دمن اور مہائم کے حکام جہازون کو مسلح کرکے جنگ کے لئے تیار ہوگئے، اسی اثنار مین ملک اشرف قانصو غوری حاکم مصر نے خاص ہدایات کے ساتھ امیر البحر امیر حسین کو ایک بیڑا دے کر ہندوستان بھیجا کہ وہ پرتگیزون کو یہان سے نکال دے، وہ بھی آگیا، اور دونون بیڑے مل کر چیون بندر جہان پرتگیز جمع ہوگئے تھے، پہنچے، گجراتی متحدہ بیڑے نے گولہ باری شروع کردی، اور ایک بہت بڑے تجارتی جہاز کو تاک کر ایسا گولہ مارا کہ آنکھون کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گیا، اس مین ایک کروڑ کا مال تھا، اس کے علاوہ اُن کے متعدد قسم کے جہاز غرق کر دیئے، غرض پرتگیزون کو بڑی سخت شکست ہوئی، دس ہزار قتل اور سات ہزار سے زیادہ گرفتار ہوئے، اور چھ سو گجراتی اور چار سو ترکی شہید ہوئے[53]،

پرتگیزون کے جیسے بڑے بیڑے کو شکست دینے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ گجراتی بیڑا کس قدر

[51] برہان مآثر ص ۱۴۴ دہلی، [52] سکندری ص ۱۱۵ بمبئی طبع دوم [53] ظفر الوالہ جلد اول ص ۳۸،

بڑا اور مضبوط رہا ہوگا، اس جنگ مین گجراتی جنگی جہازون کی تعداد کا ذکر کتابون مین نہین ملا، لیکن اوپر یہ گذر چکا ہے کہ بہادر گیلانی (ربیع ۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء) کے فتنہ کو دور کرنے کے لئے تین سو جنگی جہاز بھیجے گئے، حالانکہ وہ ایک معمولی باغی تھا، اور پرتگیزون کے مقابلہ کے لئے جن کی بحری قوت بڑی مضبوط تھی، یقیناً اس سے بڑے بیڑے کی ضرورت پڑی ہوگی، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ پانچسو سے کم جہاز نہ رہے ہون گے،

ترکی جہازون کی تعداد کل دس تھی، اس مین دو برشت اور تین غراب قسم کے باقی پانچ ہلکے قسم کے جہاز تھے، یہی سبب تھا کہ سلطان محمود اول کے زمانہ مین تمام بحر عرب مین زیادہ تر امن رہا، اور تجارت کو بے حد ترقی ہوئی[54]،

سلطان مظفر حلیم (۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء تا ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء) کا زمانہ بڑے امن کا ہے، بحری جنگ اس زمانہ مین کوئی نہین ہوئی، پھر بھی پرتگیزون کے خوف سے ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا، اس نے اُس کے وقت مین بڑے بڑے جہاز تیار ہوئے، ان جہازون مین سے دو وہ جہاز تھے، جن مین ایرانی سفیر کو واپس کیا گیا تھا، اور خراسان خان گجراتی سفیر سوار تھا[55]،

اس عہد مین امیر البحر ملک ایاز تھا، صرف بندرگاہ دیو سے ایک ہزار مسافرون اور ایک سو تجارتی جہازون کی سالانہ آمد ورفت ہوتی تھی، اور دو سو جنگی جہاز ہر وقت تیار رہتے تھے[56]، اُن مین سے غالباً ایک سو کھنبایت کے خلیج مین اور باقی دوسرے بندرون مین رہتے تھے، کیونکہ اس وقت گجرات کی ساحلی حد سندھ کی سرحد سے لیکر کوکن کی سرحد چیول بندر تک تھی،

سلطان بہادر شاہ کو توپون اور جہازون سے عشق تھا، اور وہ اپنے پایۂ تخت چانپانیر سے بار بار دیو جایا کرتا تھا، محمود کے وقت ہی سے گجراتی بیڑے کی دھاک سمندر مین بیٹھی ہوئی تھی، اور پرتگیزون

[54] ظفر الوالہ جلد اول ص ۳۰ لندن و مرآۃ سکندری ص ۱۱۶ [55] مرآۃ سکندری ص ۱۴۱،

[56] ظفر الوالہ جلد اول ص ۱۱۶، لندن،

کی ہمت نہ تھی کہ ادھر کا رُخ کریں لیکن جب بہادر شاہ مالوہ اور دکن اور چتوڑ کے فتح کرنے میں مشغول ہوگیا، اور پایہ تخت سے دور رہنے لگا، تو پرتگیزوں نے اچانک دیو پر قبضہ کر لینا چاہا، لیکن بر وقت خبر مل جانے سے بہادر شاہ دیو پہنچ گیا، اس کی اچانک آمد نے پرتگیزوں کے حواس باختہ کر دیئے، اور وہ بھاگ نکلے، اس واقعہ سے بہادر شاہ خبردار ہوگیا، اور اس نے حکم دیا کہ کھنبایت میں ہر وقت ایک سو جنگی جہاز تیار رہیں،[1]

اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ دو سو جنگی جہاز مظفر حلیم کے عہد میں دیو میں بھی رہتے تھے، اور اس کے باپ سلطان محمود اعظم کے عہد میں تین سو جنگی جہاز تھے، سلطان بہادر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، اور خود بھی جدید جہاز بنانے کا حکم صادر کیا، چنانچہ جب وہ[2] تیار ہو گئے، اور ان کو سجا کر کھنبایت کے بندر میں ان کی نمائش کی گئی، تو ان کو دیکھنے کے لئے سلطان خود کھنبایت گیا تھا،[3] اس وقت گجراتی بیڑے کی ترقی نصف النہار پر پہنچ گئی، خصوصاً ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں جب کہ مصطفےٰ بہرام (رومی خان) جنگی اور غیر جنگی جہازوں کا ایک بیڑا لیکر یمن سے دیو آگیا، اسی کے ساتھ سلیمانی توپیں بھی تھیں،[4] لیکن بدقسمتی سے سلطان دکنیوں کے ساتھ جنگ میں الجھ گیا، پھر مالوہ اور چتوڑ فتح کرنے میں مشغول ہو گیا، اور سب سے بڑی غلطی اس نے یہ کی کہ ملک ایاز کے لڑکے ملک طوغان کو جو دیو میں شاہ بندر تھا معزول کر دیا، اور اس وفادار امیر کی جگہ رومی خان (غیر ملکی) کو امیر البحر اور شاہ بندر بنایا، جس نے ہمایوں کے ساتھ جنگ کرنے میں غداری کی، آخر بہادر شاہ کو شکست ہوئی، وہ شکست کھا کر کھنبایت پہنچا، اور پھر دیو جاتے ہوئے حکم دیا کہ ایک سو جنگی جہاز جو بندر میں موجود ہیں، ان کو جلا دیا جائے، تاکہ مغلوں کے ہاتھ میں نہ جائیں، اور افسوس ہے کہ اس حکم کی پوری تعمیل کی گئی، حالانکہ اگر ان کو سمندر میں منتشر کر دیا جاتا یا دیو بھیج دیا جاتا، تو سب جہاز محفوظ ہو جاتے، کیونکہ اس وقت مغلوں کے پاس جہاز نہ تھے، جو ان کا تعاقب کرتے، اور اگر کرتے بھی تو کئی سو جنگی جہازوں

[1] ظفر الوالہ جلد اول ص ۲۴۳ لندن [2] مرآۃ سکندری ص ۲۱۶ بمبئی [3] ظفر الوالہ جلد اول ص ۲۲۱

کا مقابلہ ہمایوں کے لئے آسان کام نہ تھا،

۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں جب بہادر شاہ نے شہادت پائی، تو بحری بیڑے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا، پرتگیزوں نے دیو کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے بحری بیڑے اور تجارت کو بے حد کمزور کر دیا، گجرات کے امراء کی خانہ جنگی ختم ہونے کے بعد سلطان محمود نے پھر اس طرف توجہ کی، اور خداوند خان شاہ بندر نے نئے سرے سے بیڑے کو مرتب کیا، ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں سلیمان پادشاہ ایک ترکی بیڑے لے کر پرتگیزوں سے جنگ کے لئے آیا، لیکن اختتام جنگ سے قبل ہی لوٹ کر چلا گیا، مگر تمام جنگی سامان چھوڑ گیا، جس میں توپیں بھی بہت تھیں،[1] اس سے گجراتی بیڑے کو بڑی تقویت ہوئی، لیکن وزیر افضل خان بنبانی کی حاسدانہ حماقت سے جب خداوند خان اور دوسرے بہترین بحری افسر پرتگیزوں کے ہاتھ سے دیو میں شہید ہو گئے، تو اس سے بیڑے کو سخت نقصان پہنچا،

سلطان محمود اس سے بے حد متاثر ہوا، افضل خان کو وزارت سے معزول کر کے حکم دیا، کہ توپیں اور نئے جہاز تیار کئے جائیں، چنانچہ خداوند خان کے لڑکے رومی خان اور جہانگیر خان کی نگرانی میں یہ کام شروع کیا گیا، اور تھوڑی ہی مدت میں پانچسو نئے جنگی جہاز تیار ہو گئے، اور دوسرے بندروں میں جو پہلے سے موجود تھے، وہ ان کے علاوہ تھے،[2] اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زوال کے وقت بھی گجراتی بیڑا نہایت مضبوط، اور حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے بالکل کافی تھا،

۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں جب سلطان محمود کی شہادت کے بعد سلطان احمد ثالث تخت نشین ہوا، تو امراء پھر خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے، ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں سید علی ترکی امیر البحر جہازوں کا ایک بیڑا لے کر گجرات آیا، اور سامان حرب اور تقریباً ایک درجن جہاز گجراتی افسروں کے سپرد کر کے خشکی کی راہ سے ترکی یورپ چلا گیا،[3] مگر اس کے عملے کے نوّے فی صدی آدمی گجرات میں رہ گئے، امرائے گجرات اگر خانہ جنگی میں مبتلا نہ ہوتے، تو گجراتی بیڑے کو مضبوط کرنے میں اسے کافی مدد ملتی، لیکن سلطنت زوال کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی، اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر

[1] ظفر الوالہ جلد اول ص ۲۰۳ لندن [2] سفر نامہ امیر البحر سید علی ترکی مطبوعہ وطن لاہور،

پرتگیزون نے دیو اور دمن دونون جزیرون پر قبضہ کرلیا، اس سے بحری مرکز کا خاتمہ ہوگیا، سلطان مظفر چہارم کے زمانہ مین کھنبایت اور سورت جہازون کے مرکز بنے لیکن سورت کو اس نے فوقیت حاصل تھی کہ وہ رجب رومی خان جیسے شاہ بندر کے ہاتھ مین تھا آخر مین ہر بندر ایک ایک امیر کی جاگیر مین آگیا، اور خود سلطنت کا بحری بیڑا برائے نام رہ گیا،

۹۸۰ھ ۱۵۷۲ء مین اکبر نے جب گجرات پر قبضہ کیا، تو گجراتی بیڑا اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ بالکل مدافعت کے قابل نہ رہ گیا تھا، چنانچہ خان اعظم جب حج کے لئے گیا، تو اسکو سمندر مین پرتگیزون کو سمندری محصول ادا کرنا پڑا،

اکبر کے بعد جہانگیر اور شاہجہان کے عہد مین پھر بحری بیڑا ترتیب دیا گیا، لیکن پرتگیزی بیڑے کے مقابلہ مین اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، عالمگیر کے زمانہ مین بیڑے مین کچھ طاقت آگئی، چنانچہ بمبئی وغیرہ سے انگریزون کے نکال دینے کا کام اسی سے لیا گیا، اور سورت کے شاہ بندر کو حکم دیا گیا کہ فرنگی جہاز سمندر سے نکال دئیے جائین، لیکن حق یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کو سمندر کی جانب کامل توجہ کبھی نہین ہوئی، اسی لئے عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی، امیرون کی نااتفاقی اور خانہ جنگی نے اس شاہی بیڑے کا بھی خاتمہ کر دیا جس نے عالمگیر کے زمانہ مین ذرا سنبھالا لیا تھا، مغلون کے زوال کے ساتھ ساتھ پرتگیز اور ولندیز ترقی کرتے گئے، یہان تک کہ وہ بحر عرب اور بحر ہند کے مالک ہوگئے، اور ہندوستان کے تمام سواحل اُن کے رحم وکرم پر ہوگئے، پھر جب انگریزون اور فرانس کے بیڑے نے ترقی شروع کی، تو پرتگیز اور ولندیز کو بھی زوال آگیا، اور وہ چند ساحلی مقبوضات کے سوا تمام مقامون سے نکال دئیے گئے، اور آخر مین فرانس کو بھی انگریزون نے نکال باہر کیا، اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے تمام ساحلی علاقون (بمبئی، مدراس، بنگال) پر قبضہ کرلیا، اس کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلا کہ بحری جنگی بیڑے کا خاتمہ تو سلطنت کے زوال کے ساتھ ہو ہی گیا تھا، اب تجارتی بیڑے کا بھی خاتمہ ہوگیا،

مغلیہ عہد مین سلطنت کا بحری بیڑا تو برائے نام ہی تھا لیکن تاجرون کے پاس ذاتی جہاز بکثرت تھے، جو عرب، مصر، ایران، عراق، شام، افریقہ، اور جزائر سے تجارت کر کے بڑا نفع حاصل کرتے تھے، سورت اس کا بڑا مرکز تھا، عبدالغفور نامی ایک تاجر کے پاس جو سورت مین رہتا تھا، اتنے ذاتی جہاز تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس بھی نہ تھے، لوگون کے پاس مسافری جہاز بھی بہت تھے، خصوصاً عرب اور ایران سے انکی بڑی آمد ورفت تھی،

بندر کی آمدنی

ان بندرون سے سلطنت کو کیا آمدنی تھی، اس کا صحیح حساب بتانا بہت مشکل ہے، مگر خوش قسمتی سے تاریخون مین بعض ایسی جزئیات مذکور ہین جس سے ہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ ان بندرون کی آمدنی کیا ہوتی ہوگی،

مولوی سکندر صاحب نے سلطان بہادر کے حالات مین لکھا ہے کہ شاہ طاہر جب نظام الملک کی طرف سے سفیر بن کر آئے، اور اُن کی علمی لیاقت اور شیرین زبانی سے متاثر ہو کر سلطان نے ان کی عزت افزائی کی تو ایرانی تاجر اُن کے سر ہوگئے کہ ہمارا محصول بحری بہت زیادہ ہے، اس کو معاف کرا دین، اُن کے اقرار پر وہ ملک ایاز کے لڑکے ملک طوغان کے پاس دیو گئے، جہان اس وقت شاہ بندر تھا، اور ایرانی تاجرون کی عرض داشت پیش کی، ملک طوغان نے دفتر سے معلوم کیا کہ واجب الادا محصول کی کل رقم ساٹھ ہزار روپئے[1] ہے، اور اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ معاف کر دیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب صرف ایرانی تاجرون کا محصول ساٹھ ہزار روپیہ تھا، تو ایک سو تجارتی اور ایک ہزار مسافر جہازون سے کتنی رقم وصول ہوتی ہوگی،

آصفی نے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ سلطان محمود ثالث نے قندھار (گندھار) متصل بھروچ، بندر کی آمدنی مکہ اور مدینہ کے لوگون پر وقف کر دی تھی، پھر لکھتا ہے کہ کھنبایت کی خلیج مین یہ ایک چھوٹا سا بندر ہے، جس کی آمدنی ایک لاکھ اشرفی (پونڈ)[2] ہے، اسی سے آپ بھی اندازہ لگا سکتے ہین، کہ جب ایک چھوٹے

[1] مرآۃ سکندری ص ۲۲۳ [2] ظفر الوالہ ص ۳۱۳ جلد اول،

بندر کی آمدنی ایک لاکھ دینار (پونڈ) تھی تو پھر کھنبایت، بھروچ، سورت، گھوگھا، دیو، تن، سومنات،
قائم اور تھانہ کے بندروں کی آمدنی کتنی ہوتی ہوگی، مراۃ محمدی میں ۵۱ بندرگاہوں کی آمدنی پانچ کرو[ڑ]
بتائی ہے لیکن اس کا ماخذ نہیں بتایا ہے، ممکن ہو کہ مراۃ احمدی کے مقدمہ سے اخذ کیا ہو، لیکن جیسا کہ آگے
اس کا ذکر آئے گا، وہ خود مشکوک ہے،

مراۃ احمدی کے مقدمہ میں چوراسی بندرگاہوں کا ذکر ہے، جن میں سے کچھ بندروں کے نام
ذیل میں دیئے ہیں :-

"دیو بندر، بھیم بندر، باوار پور بندر، کاچ پٹن بندر، فرنگی بندر،"

جو محصول یا خراج دیتے تھے، مندرجہ ذیل ہیں :-

"چیول، ڈابھول، بلاول بستی، ڈنڈا راج پوری، نوبا، بمبئی، گگری کوٹ، کالسن، کوہا مرت، کاکینی، طبھا، ال دیو، دھورہ، ہندست، قوانگر، بندر عرب"

مسقط کے متعلق جو بندر تھے، اُن کے نام یہ ہیں :-

"کمرانہ، بصرہ، لوبھی، لاہری، ہرفر ساده، سیکو، دھاسری، ملکیت، مکینہ، ملتہ، سنوال ہسو، قردا، پونما، بدچی خان، بتید، میر بھائی، بند اس، چین، ملاخد، بدر سا، گلستان، دمار، راکل، جادہ،"

لیکن یہ فہرست صحیح نہیں ہے کیونکہ ڈابھول اور چیول دکن کی بندرگاہیں ہیں، گجرات سے ان کو کوئی
تعلق نہیں، اسی طرح عرب کی بندرگاہیں، مسقط اور بصرہ ہندوستان سے باہر ہیں، کمرانہ لاہری، ہرفر ساده،
فارس کے بندر ہیں، چین اور جادہ ہندوستان سے بہت دور ہیں، اسی لئے خود علی محمد خان نے اس فہرست
کے بعد تحریر کیا ہے،

"ہرچند کہ تصدیق شرح صدر اکثرے داخل تعجب می نماید"

یعنی اس کی تصدیق کرنا مشکل ہے، مراۃ احمدی کا ماخذ نکمۂ دیوانی، سررشتہ داد موروثی مول چند

کا دفتر ہے، مصنف کا بیان ہے کہ مول چند کے دفتر کے سوا اور کوئی چیز کہیں نظر سے نہیں گذری جس سے
اس کی تصدیق ہو سکے[۱]

اصل یہ ہے کہ مول چند کے بزرگوں نے دیوانی دفتر میں گجرات کے بندروں کے نام نہیں تحریر کئے تھے بلکہ
یہ تحریر کیا تھا کہ گجرات کے بندروں میں کس کس جگہ سے جہاز آتے تھے، اور اُن سے کس قدر آمدنی ہوتی
تھی، لیکن مرہٹوں، بابیوں، اور حامد خان کے ہنگاموں میں دیوانی دفتر منتشر ہوگیا، اس نے صحیح معلومات
کا ذریعہ مول چند کے پاس نہیں رہا تھا، دفتر میں بندروں کے نام اور رقم دیکھ کر سمجھے کہ یہ سب بندر گجرات
ہی کے ہیں، حالانکہ بصرہ، مسقط، جاوہ اور چین، ہندوستان میں نہیں ہیں، سلیمان تاجر بصری نے اپنے
سفر نامہ میں لکھا ہے کہ کوکن (تھانہ) میں چینی جہاز آتے ہیں، ان سے ایک ہزار درہم اور دوسرے
جہازوں سے دس دینار (پونڈ) تک محصول لیا جاتا ہے[۲]

جہازوں کے کارخانے

جہاز بنانے کے کارخانہ کو عربی میں "دار الصناعۃ" کہتے تھے، اسی کا بگڑا
ہوا لفظ انگریزی میں "ڈارسنا" ہے، جو اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، گجرات میں قدیم زمانہ سے جہاز
اور کشتیاں بنتی تھیں، اس کا ثبوت قدیم کتابوں سے ملتا ہے، چنانچہ بلی مورا، کچھ، اور کاٹھیاواڑ میں
بڑے بڑے جہاز بنتے تھے، اور ہندوستان کے ساحلی مقامات میں آمد و رفت کرتے تھے[۳] ان میں تجارتی
بھی ہوتے، اور سفری بھی، سرکاری جنگی بیڑہ کا تو پتہ نہیں چلتا، لیکن اس زمانہ میں چاچیا (بحری ڈاکو) بکثرت
تھے، جو مسلح رہتے تھے، یہ زیادہ تر جاٹ اور گجراتی ہوتے تھے، ابوریحان بیرونی نے بھی ان بحری قزاقوں کا ذکر
کیا ہو کہ بحر عرب میں یہ لوگ لوٹ مار کرتے ہیں، اور کچھ ان کا مرکز ہے، لیکن کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذرا
کہ ان کے جہاز سفری جہازوں کے برعکس جنگی جہازوں کی طرح ہوتے تھے، عرب اور ایرانی مسلمان تاجر
ابتدا میں عرب سے جہاز لے کر آتے تھے، اور چونکہ یہاں کے جہاز ان کے کام

۱ مراۃ احمدی کا مقدمہ ص ۲۳، کلکتہ ۲ کتاب الہند والسند پیرس ۳ گجرات نو دہاں دو ص ۲

کے ہوتے تھے، اس لئے وہ زیادہ توجہ انہی جہازون پر رکھتے تھے، جو عرب مین تیار ہوتے تھے، لیکن جب گجرات مین ان کا مستقل قیام ہو گیا تو پھر اس طرف بھی انھون نے توجہ کی، اور کھنبایت اُن کا مرکز تھا،

اسلامی عہد مین سرکاری بیڑے کا ذکر گجراتی سلاطین سے قبل کسی گجراتی تاریخ مین میری نظر سے نہین گذرا، محمد تغلق کے زمانہ مین ابن بطوطہ جب سفارت چین پر روانہ کیا گیا ہے، تو وہ گندھار (بھروچ) سے جہاز پر سوار ہوا، اس کا بیان ہے کہ ہم ناخدا ابراہیم کے جہاز پر سوار ہوئے، چھ جہاز جنگی اپنی ملکیت کے تھے، تحفون کے گھوڑون مین سے ستر گھوڑے بھی اس جہاز مین ساتھ تھے، باقی گھوڑے اور نوکر ابراہیم کے بھائی کے جہاز مین سوار ہوئے، راجہ نے ہم کو ایک جہاز دیا تھا جس مین ظہیر الدین کے گھوڑے اور سنبل اور اُن کے نوکر سوار ہوئے، راجہ نے ایک دوسرے جہاز مین اپنے بیٹے کو ساتھ کر دیا تھا، یہ جہاز غراب کشتی کے مشابہ تھا، لیکن اس کو کچھ بڑا تھا، اس جہاز مین ساٹھ چپو تھے، لڑائی کے وقت جہاز پر چھت ڈالدیتے تھے جس سے چپو چلانے والے پتھر اور تیر سے محفوظ رہتے تھے، ہمارے جہاز مین پچاس تیر انداز، اور پچاس جنگی سپاہی تھے[1]،

اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ ہندوستانی سفارت جو شاہ دہلی کی جانب چین جا رہی تھی، اس کے سارے لوگ کرایہ کے جہاز مین سوار تھے، اگر سرکاری بیڑا اس زمانہ مین ہوتا، تو وہ سفیرون کو لے کر جاتا، جیسا کہ سلطان مظفر گجراتی نے ایرانی سفارت اپنے سرکاری جہازون پر بھیجی تھی،

سلاطین گجرات مین سے سلطان احمد اول پہلا بادشاہ ہے جس کے پاس سرکاری بیڑا تھا، اس کا مرکز کھنبایت تھا، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جہازون کے کارخانے بھی ایسی جگہ ہون گے، کیونکہ پارسیون کی بڑی تعداد یہان آباد تھی، اور یہ لوگ جہاز بنانے مین بڑے ماہر تھے، سلطان محمود کے پاس تین سو جنگی جہاز تھے، اس کے زمانہ مین کھنبایت کے بعد دیو کا بندر ترقی کر رہا تھا، میرا خیال ہو کہ کھنبایت

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم باب ۱۹،

گھوگھ کے علاوہ اس نے دیو مین بھی جہاز سازی کے کارخانے کھولے تھے، سلطان بہادر کے زمانہ مین بھی جہاز سازی کا کام کھنبایت، گھوگھ، دیو کے علاوہ دمن اور بھروچ مین بھی ہوتا تھا،

سلطان محمود ثالث متوفی ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء کے عہد مین سورت، بھروچ، گھوگھ، دمن اور کھنبایت مین بڑے بڑے کارخانے تھے[1]، ان کارخانون کی وقعت کا اندازہ اس واقعہ سے لگا سکتے ہین کہ اس زمانہ مین چند مہینون مین ان کارخانون مین پانچ سو جنگی جہاز تیار ہو گئے تھے، جب پرتگیزون سے جنگ مین توپ اور جہاز بہت ضائع گئے تھے، اور اندیشہ تھا کہ وہ کہین سورت پر حملہ نہ کر دین تو یہ کارخانے بڑے بڑے جہاز تیار کرتے تھے، باقی متوسط درجہ کے جہاز ... کچھ سومناتھ، تھانہ، راندیر اور دوسری بندرگاہون مین بھی بنائے جاتے تھے، چھوٹی، اور ملکی کشتیان تو ہر بندر پر معمولی نجار بنا لیتا تھا، جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے[2]،

مغلیہ زمانہ مین گو سرکاری طور پر اس طرف کامل توجہ نہین رہی لیکن خانگی کارخانے برابر قائم رہے، کہا جاتا ہے کہ ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء مین مشہور نیلسن کا جہاز "وکٹری" نامی گجراتی کاریگرون نے بنایا تھا، جس کا وزن دو ہزار ایک سو باسٹھ (۲۱۶۲) ٹن تھا، یہ باون فٹ عریض اور ۲۰۰ فٹ طویل تھا، اس مین سو توپین اور سات سو سے زیادہ سپاہی سما سکتے تھے، سورت کا جہاز سازی کا کارخانہ بہت عمدہ حالت مین تھا؛ گجرات کے سورت بندر اور دوسری جگہون کے جہاز بارہ سو سے پندرہ سو ٹن تک سامان بار کرتے تھے، آخر زمانہ مین جہاز سازی مین پارسی لوگ زیادہ ماہر تھے، چین مین بھی تجارت کے لئے بڑے بڑے جہاز تیار کئے جاتے تھے اور دو یا پانچسو سے ہزار ٹن تک وزن کا مال لیجاتے تھے،

پھر یہ کارخانے سورت سے منتقل ہو کر بمبئی چلے گئے، اس کے کاریگر پارسی اور گجراتی تھے، ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء تک جہاز سازی کے لئے لوجی نوشیروان جی کا خاندان بڑا مشہور تھا، یہ جہاز ساگون کی لکڑی سے بناتے تھے، غرض انگریزون کے تسلط سے قبل تک گجرات مین جہاز سازی کے کارخانے موجود تھے، اور بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا جہاز بانزاکت تیار ہوتا تھا،

[1] ظفر الوالہ جلد اول ص ۲۸۳، لندن [2] گجرات لو دہان دو مطبوعہ گجرات ورنیکولر سوسائٹی احمد آباد،

گجرات گزٹیر مین ہے کہ سورت مین جہاز سازی کے کارخانے تھے، اس کام مین پارسی ہوشیار تھے، اُن کے بنائے ہوئے جہازون پر اٹھائیس ہزار من تک مال لادا جاتا تھا،

"گجرات نو وہاں ڈو" مین ہے، کہ سورت مین ایک ہزار سے بارہ سو ٹن تک کے جہاز بنتے تھے، اُن کے تین چار بادبان ہوتے تھے، ۱۶۱۲ئہ مین سر ہنری مڈلٹن نے بحر احمر کی طرف جانے والے جس سورتی جہاز کو روکا تھا، وہ پندرہ سو ٹن کا تھا، ایک سو باون فٹ طویل، بیالیس فٹ عریض، اور اکتیس فٹ بلند تھا، جنگ نامی جہاز جو ایک گجراتی "ڈھول سٹھ بھروچی" کا تھا، اس مین سولہ بادبان بڑے اور چار چھوٹے تھے، غراب قسم کے جہاز بھی بمبئی مین بنتے تھے، لیکن اس کا اصلی مرکز مالابار تھا، لیکن ایسٹ انڈیا کے اثر اور تسلط سے قبل گجراتی بندرون مین سلاطینِ گجرات کے وقت ہر قسم کے جنگی تجارتی اور مسافرون کے جہاز تیار ہوتے تھے،

جہازون کے اقسام جہاز تین قسم کے ہوتے تھے، جنگی مسافر، تجارتی، ان مین جنگی جہازون کی بڑی اہمیت تھی، اور چونکہ یہ مختلف سائز مختلف اوزان، اور مختلف کامون کے لئے بنائے جاتے تھے، اس لئے اُن کے نام بھی الگ الگ ہوتے تھے، اُن کے چند نامون کے ساتھ ان کا مختصر خاکہ دیا جاتا ہے،

سواتی:- یہ بڑا جنگی قلعہ نما جہاز ہوتا تھا، اس مین متعدد برج ہوتے تھے، جو مدافعت کے کام آتے تھے، اس مین کئی طبقے ہوتے تھے، اعلیٰ طبقہ مین تیرانداز فوج، اور آخری مین ملاح، باروداندازو غیرہ ہوتے تھے،

شینی:- متوسط قسم کے جنگی جہاز مین ایک سو پچاس سپاہی کی گنجائش ہوتی تھی، اور ایک سو تینتالیس ڈانڈون سے چلتے تھے،

شونہ:- بڑا جنگی جہاز حراقہ کے برابر،

حراقہ:- یہ بڑا جہاز ہوتا تھا، مگر شینی سے چھوٹا، اس مین میگزین توپ، اور بارود وغیرہ

رکھتے تھے، اس کا سرا بعض جانورون مثلاً ہاتھی، شیر، عقاب، سانپ (اژدہا) کی شکل کا ہوتا تھا،

طریدہ:- یہ بھی جنگی کشتی تھی، جو سوارون کے لئے مخصوص تھی، اس مین صرف چالیس گھوڑے رہ سکتے تھے،

طراد:- یہ طریدہ سے بھی چھوٹا جہاز تھا، اور اس مین سوار بھی کم آتے تھے، اکثر سوار زیادہ تر تیرانداز ہوتے تھے

تیزرو:- یہ ایک قسم کا جنگی جہاز تھا، جو بہت تیز جاتا تھا، اسی لئے اس کا نام تیزرو تھا،

شلندی:- یہ بڑا جنگی جہاز، مسطح، اسلحہ اور مسلح سپاہیون کے بچانے کے لئے تھا، شونہ اور حراقہ کے برابر ہوتا تھا،

غراب:- قدیم زمانہ کا ہلکے قسم کا جہاز، دو چھوٹے بادبان والا، لیکن بعد کو یہ جنگی جہاز بن گیا، اس کی ساخت کوّے (پرندے) کے مثل ہوتی تھی، غراب عربی مین کوے کو کہتے ہین، اس مین کم از کم سو آدمی سوار ہوتے تھے،

شباک:- چھوٹا جنگی جہاز جو بحر ابیض اور بحر متوسط مین چلتا تھا،

قارب:- مثل غراب کے ہوتا، اس مین نوکر پیشہ اور خادم سوار ہوتے، اسی کی جمع قوارب آتی ہے،

الحمالات:- بڑا جنگی جہاز تھا جس مین خوراک، سائیس، کاریگر، آلاتِ محاصرہ، دبابہ، خشبی برج وغیرہ لادے جاتے تھے، اور دشمن سے مخفی رکھنے کے لئے جہاز پر پردہ ڈال دیتے تھے، جس کو ستائر کہتے تھے،

بطس:- بھاری بھرکم، بڑا عظیم الشان، اور بڑا خوفناک جہاز تھا، جس مین کئی ہزار سوار سما سکتے تھے، اور اس کے متعدد طبقے ہوتے تھے، ان مین بعض صرف فوجیون کے لئے مخصوص تھے، اس کی شکل مچھلی کی ہوتی تھی،

سیمبرت:- اس مین چالیس مجذاف یعنی ڈانڈے ہوتے تھے،

شذوات اور حبابیات:- دونون پہلے جنگی جہاز تھے، بعد مین مسافری ہوگئے،

عکیری:- غراب کے مشابہ، لیکن اس سے کہین زیادہ وسیع ہوتا تھا، اس مین ساٹھ ڈانڈے ہوتے تھے، اور جنگ کے وقت اس پر چھپٹ ڈالتے تھے، یہ جہاز سندھ اور بحر عرب (گجرات) مین زیادہ مستعمل تھا،

بیڑہ:- اس کو عربی مین بارجہ کہتے ہین جس کی جمع بوارج آتی ہے، یہ بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا، متعدد جہاز جب آگے پیچھے ساتھ ساتھ چلتے تھے، تو اُس کو بیڑہ کہتے تھے[۱] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد مین یہ لفظ جنگی جہاز کے لئے مستعمل ہونے لگا، چنانچہ بارجہ (بیڑہ) اس بڑے جنگی جہاز کو کہتے ہین جس پر پردے نہین ہوتے، وہ شونہ کے برابر ہوتا تھا جس مین بڑی فوج سما سکتی تھی،

برشت:- غراب کی طرح یہ بھی جنگی جہاز تھا لیکن ان دونون مین کیا فرق تھا، یہ نہین معلوم ہو سکا،

جنک:- بعض جگہ یہ لفظ جُنگ بضم اول وکاف فارسی پایا گیا ہے، ایک بڑا جہاز ہوتا تھا، ابن بطوطہ نے چینی جہازون کے ضمن مین اس کا ذکر کیا ہے، اسی طرح ترکی اور ہندوستانی جہازون کے ساتھ اس کا نام آتا ہے، اس کے بارہ مستول ہوتے تھے، جو بید کی لکڑی کے بنے ہوتے تھے، اور بادبان بھی بید کی طرح سے بنے ہوئے ہوتے تھے، اُن کو کبھی نیچے نہین گراتے بلکہ ہوا کے رُخ اُن کو پھیر دیتے ہین، جب جہاز لنگر ڈالتے ہین، تو بھی بادبان کھڑے رکھتے ہین، اور ہوا کے ساتھ اڑتے رہتے ہین، ہر جہاز مین ہزار آدمی ہوتے ہین، چھ سو تو جہازرانی کے متعلق کام کرتے ہین، اور چار سو سپاہی ہوتے ہین، ان مین سے کچھ تیر انداز اور چرخی کے ذریعہ سے نفت پھینکنے والے ہوتے ہین، ہر بڑے جہاز کے ساتھ تین جہاز اور ہوتے ہین، پہلا اس بڑے جہاز کا نصف، اور دوسرا اس کا نصف، اور تیسرا بڑے کا چوتھائی، جنک جنگی

[۱] نور اللغات جلد اول لکھنو،

جہاز تھا، اب مسافری ہو گیا، اب بھی چین، اور ہند مین بڑے جہاز کو جنک کہتے ہین،

گیلن:- یہ بھی ایک قسم کا جنگی جہاز تھا، اس کا ذکر سید علی امیر البحر ترکی نے اپنے سفرنامہ مین کیا ہے[۱]، یہ سب جہاز اس زمانہ مین اسی طرح کے تھے، جیسے آج کل کروزر، سٹمرین ڈسٹرائر، ڈریڈناٹ وغیرہ ہین،

تجارتی جہاز: تجارتی جہاز اس زمانہ مین ایسے ہی ہوتے تھے جیسے آج کل کے ہوتے ہین، اُن مین مال بھر دیتے تھے، اور عملہ کے علاوہ بعض دفعہ مالک جہاز، اور مالک مال (یعنی تاجر) یا ایجنٹ دوسری منزل پر ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور بعض دفعہ مال بھر کر ناخدا کے سپرد کر دیتے، اور وہ موقع مناسب سے فروخت کر دیتا، اور کمیشن کاٹ کر نفع مع اصل مالک کے حوالہ کر دیتا، جب سمندر مین خطرہ ہوتا، تو اس جہاز پر سپاہی مسلح ساتھ کر دیے جاتے، بعض دفعہ مسلح جہاز ڈاکوؤن (بحری قزاق) سے لڑنے، اور مال کی حفاظت کے لئے آگے پیچھے ہوتے تھے، کچھ جہاز ایسے بھی ہوتے تھے، جن مین آدھے جہاز مین تجارتی مال ہوتا تھا، اور نصف مین مسافر اور اُن کا اسباب ہوتا، اسی مین جنگی سامان اور سپاہیون کے لئے بھی ایک حصہ مخصوص ہوتا تھا، تجارتی جہاز کھنبایت، دیو، دمن، بھروچ، سورت وغیرہ سے بصرہ، سیراف، بحرین، قطیف، عدن، مخا، مین جدہ تک جاتے تھے، اور مشرق مین لنکا، مالدیپ، برما، سیام، جاوا، سوماترہ، جاپان، چین تک پہنچتے تھے، اس جہاز کو آج کل ہندوستان مین قدو جہاز کہتے ہین، ایک دفعہ راقم الحروف کو کلکتہ مین ایک جاپانی جہاز دیکھنے کا اتفاق ہوا، جو رنگون جا رہا تھا، اور وہ ہر بندرگاہ پر قیام کرتے کرتے بہت دنون مین پہونچتا، اس مین دو ہی درجے دیکھے، ایک نیچے کی منزل جس مین مال بھرا تھا، اور دوسری منزل مسافرون کے لئے، رنگون کے دوسرے جہاز کا ٹکٹ نہین مل رہا تھا، اس لئے خیال ہوا کہ اسی پر سوار ہو جاؤن لیکن معلوم ہوا کہ اس پر وہی مسافر جاتے ہین جن کا مال ہوتا ہے، اور اسی لئے مسافرون کی جگہ بہت تھوڑی ہے،

[۱] الاسطول الاسلامی مصر و سفرنامہ امیر البحر سید علی ترکی وطن لاہور، سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم اردو دہلی [۲] مجالس رنگین ص ۵۹، لکھنو،

اور دراصل یہ لدو جہاز ہے،

مسافری جہاز | مسافری جہازوں کی ساخت دوسرے قسم کی ہوتی تھی، عموماً نیچے کے حصہ میں مال و اسباب رکھتے تھے، اور درمیانی حصہ مسافروں کے لئے ہوتا تھا، ایک منزلہ دو منزلہ اور بعض جہاز تین منزلہ ہوتے تھے، سب سے اوپر افسران جہاز کا مکان ہوتا تھا، یعنی ناخدا، ربان، معلم وغیرہ، ہر جہاز میں رہنے کی جگہ بالکل گھر کی طرح بنائی جاتی تھی، اس میں کوٹھریاں بھی ہوتی تھیں، اور کوٹھریوں میں دریچے، اور کھڑکیاں ہوتیں، سنڈاس بھی ہوتا تھا، تاکہ گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہ پیش آئے، اس پورے گھر کا دروازہ ہوتا تھا، جو شخص کوٹھری لیتا وہ اپنا قفل لگا دیتا، اور جب اندر سے دروازہ بند کر لیا جاتا تو یہ معلوم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اندر کون ہے، جہاز میں ملاح اور سپاہی بھی ہوتے، اور اُن کے اہل وعیال بھی ساتھ ہوتے تھے، جہاز کے پچھلے حصہ کو بوسہ کہتے تھے، اس میں لکڑی کا حوض بنا کر ترکاریاں وغیرہ بوتے تھے، یہ مکانات مع کوٹھریوں کے کبھی صرف ایک ہی تاجر لیتا تھا، تاکہ پردہ دار عورتیں ساتھ رہ سکیں، اور کبھی کئی کئی تاجر مل کر لیتے، اور ہر شخص ایک ایک کوٹھری (کمرہ یا حجرہ) پر قابض ہو جاتا، اگر سمندر میں قزاقوں کا خطرہ ہوتا تو تیر انداز سپاہی بھی سوار کرتے جاتے، اور نفت انداز بھی ہوتے، ایک اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھا، سپاہیوں کی بارکیں، اور اسلحہ خانہ مسافروں کے مکانوں سے الگ عموماً اوپر کے درجہ میں ہوتا تھا، (باقی)

اقبال و جیمس وارڈ

(حصۂ اوّل)

از

جناب ڈاکٹر عشرت حسن صاحب انور، ایم اے، پی، ایچ ڈی لکچرار شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۴)

پچھلے مقالہ[۲] میں اقبال اور نیٹشے کا مقابلہ کیا جا چکا ہے، اس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اقبال نیٹشے کے فلسفہ سے اگرچہ بہت متاثر ہیں لیکن کسی طرح بھی اُس کے تابع نہیں ہیں، اکثر اصحاب نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے، لیکن صرف یہ کہدینا کافی سمجھا ہے کہ

"اقبال بہ نسبت نیٹشے کے فشتے سے زیادہ متاثر ہیں، فشتے کی کشمکش حیات میں اخلاق اور روحانیت کی بھی چاشنی ہے، جو نیٹشے میں اس قدر نمایاں نہیں، فشتے ایک خاص انداز کا موحد ہے، اور نیٹشے منکر خدا ہے"[۳]

---

[۱] یہ حصہ دونوں حکماء کے خودی کے نظریات سے متعلق ہے، اگلا حصہ ان نظریات سے متعلق ہوگا جن کا تعلق خدا کے وجود سے ہو۔ [۲] اقبال اور نیٹشے، معارف بابت جون و جولائی ۱۹۵۱ء [۳] اقبال کامل از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی ص ۳۰۲، یہ عبارت رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۲ سے ماخوذ ہے، جو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اقبال، نیٹشے اور رومی کے سلسلہ میں تحریر فرمائی ہے، اسی عبارت کو مولانا عبدالسلام صاحب نے اپنی کتاب اقبال کامل کے ص ۴۴ پر اس طرح نقل فرمایا ہے گویا وہ خود بھی اس رائے سے متفق ہیں،

ہمارے خیال میں اس بیان کی تائید میں کہ اقبال بمقابلہ نیٹشے فشٹے سے زیادہ متاثر ہیں، کوئی ثبوت بہم پہونچانا بہت مشکل ہوگا، نیز یہ ثابت کرنا بھی تقریباً ناممکن ہے کہ نیٹشے کے یہاں بھی اخلاق اور روحانیت کی چاشنی ہے، مگر نمایاں نہیں، جیسا کہ مذکورۂ بالا بیان سے مترشح ہوتا ہے، ہمارے خیال میں نیٹشے کے یہاں اخلاق اور روحانیت کا کوئی عنصر نہ در پردہ معلوم ہوتا ہے، اور نہ بے پردہ نظر آسکتا ہے، اور اقبال کو فشٹے سے متاثر خیال کرنا بھی غیر ضروری ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اقبال نیٹشے سے پورے پورے طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ اُن کے بعض نظریات اور خیالات جو صرف انہی کی تخلیقِ فکر کا نتیجہ ہیں، فشٹے کے خیالات سے متوازی اور مماثل نظر آتے ہیں لیکن تاریخی شہادت کی عدم موجودگی میں صرف ظاہری مماثلت کی بنا پر اقبال کے فلسفۂ خودی کو فشٹے سے ماخوذ تصور کرنا حق بجانب ہوگا، اور اقبال کے مخصوص فلسفۂ خودی[۵۱] کی اہمیت کو کم کرنا، اور اس مخصوص فلسفہ کی تعمیر میں اقبال جن جن مراحل اور منازل سے گذرے ہیں، اُن کو یکسر نظر انداز کرنے کا مترادف ہوگا،

اقبال اور نیٹشے میں ایک بنیادی اختلاف ہے جس کی جانب عام طور پر لوگ متوجہ نہیں ہوئے ہیں، اس مقالہ میں بالواسطہ اس طرف بھی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی جائیگی، اقبال نیٹشے کی طرح "خودی" کے قائل ہیں لیکن ان میں اور نیٹشے میں امتیازی فرق یہ ہے کہ نیٹشے "خود" کا معترف ہے، اور "غیر خود" کا وجود کسی طرح بھی ماننے کو تیار نہیں ہے،[۵۲] بالفاظ دیگر وہ خود پسند ہے، خود پرست ہے، اقبال خود پسند EGOIST نہیں بلکہ "غیر خود" کے بھی معترف ہیں، ان کی خود بینی جہان بینی کے ساتھ ساتھ ہے یہ EGOIST نہیں بلکہ PLURALIST ہیں، یہ اپنی خودی کے ہی نہیں، بلکہ دوسروں کی خودی کے بھی قائل ہیں، انفرادی خودی ہی نہیں، بلکہ اجتماعی خودی بھی تسلیم کرتے ہیں، اسی وجہ سے "دیوانہ بہ کارگہ شیشہ گر" نہ بن سکے، اس

۵۱ اقبال کا مخصوص نظریۂ خودی اقبال اور رومی کے موازنہ کے بعد ہی پورے طور پر واضح ہو سکے گا ۵۲ کسی قدر یہی صورت فشٹے کی بھی ہے، وہ موحد ضرور ہے، لیکن اس کا خدا اقبال کا خدا نہیں بن سکتا،

سلسلہ میں اُن پر سب سے بڑا اثر جیمس وارڈ اور میکٹیگرٹ[۵۱] کا پڑا ہے،

اس مقالہ میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اقبال جیمس وارڈ سے کس طرح متعلق ہیں، اور جیمس وارڈ کے بنیادی اصول یعنی کثرتِ افراد کا اعتراف کرنے کے بعد نیٹشے کے فلسفۂ خودی کے خطرناک نتائج اقبال کے فلسفۂ خودی سے کس طرح خود بخود دور اور ان کے نظامِ فکر سے کس طرح یکسر خارج ہوگئے ہیں، جس کی بنا پر بعض اصحاب کو یہ گمان تک پیدا ہوگیا ہے، کہ "اقبال بمقابلہ نیٹشے فشٹے سے زیادہ متاثر ہیں، چونکہ فشٹے کی کشمکشِ حیات میں اخلاق اور روحانیت کی بھی چاشنی ہے"[۵۲]

جیمس وارڈ کا فلسفہ بڑی حد تک لیبنیز (LEIBNITZ) کے خیالات کا مرہونِ منت ہے، لیبنیز کا خیال تھا کہ کسی باغ میں دو پتے بھی ایک طرح کے نہیں ہو سکتے، شاخ و شجر کا ہر ایک پتہ، اور زمین کا ہر ذرہ اپنی اپنی جگہ وحید اور بے مثل ہے، نہ دو پتے ایک دوسرے سے مشابہ ہو سکتے ہیں، اور نہ دو ذرّے ایک دوسرے سے مماثل کہے جا سکتے ہیں :-

ع جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

یہی خیال جیمس وارڈ کے مخصوص فلسفہ کا بنیادی اصول ہے، اس کا خیال ہے، کہ کثرتِ وجود کے اقرار اور اعتراف کے بعد ہی کسی صحیح فلسفہ کی تعمیر ہو سکتی ہے، وحدت الوجودی حکما، (مثلاً اسپینوزا جس کے نظام کی تردید ہی میں لیبنیز نے قلم اٹھایا تھا) کہ یہ بڑی بھول تھی کہ وہ لوگ وحدتِ وجود کے تصور میں اس طرح محو تھے، کہ اپنے اردگرد کثرتِ وجود کا اقرار کرنے سے بھی قاصر رہے،

ان اصحاب کے قطعی برعکس جیمس وارڈ کثرت وجود کو ایک لازمی حقیقت سمجھتا ہے، یعنی میرے علاوہ دوسرے افراد بھی موجود ہیں، جو قلباً، فکراً، روحاً، ظاہراً و باطناً مجھ سے بالکل مختلف ہیں،

۵۱ اقبال اور میکٹیگرٹ کا مقابلہ کسی اگلے مقالہ میں پیش کیا جائے گا ۵۲ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۲۲،

کائنات میں ہر شے ایک مخصوص انفرادی حیثیت رکھتی ہے، اور ایک انوکھی نئی نرالی انفرادیت حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے، یہ انفرادیت انسان کے وجود میں بہت نمایاں ہو جاتی ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف بنی نوع انسان ہی اس انفرادیت کا حامل ہے، انفرادیت کا ذوق ہر شے میں ہے، ذرہ ذرہ اسی کے لئے تڑپ رہا ہے، ہر شے کو جس قدر انفرادیت حاصل ہوتی ہے، اسی قدر اس کو عالم وجود میں اہمیت اور رفعت میسر ہوتی ہے، ارتقا کے یہی معنی ہیں، ارتقار کا سلسلہ اسی انفرادیت کے حصول کے لئے کارفرما ہے، لفظ ارتقار کا یہی مفہوم ہے کہ کوئی مقصود و مطلوب پیش نظر ہے، کوئی ایسی منزل ہے، جس کے حصول کے لئے کوشش جاری ہے، ورنہ بغیر کسی مقصود کے ارتقار ایک بے معنی لفظ تصور کیا جائے گا، ترقی اسی وقت ترقی سمجھی جا سکتی ہے، جب کہ کوئی مقصد پورا ہو رہا ہو، ورنہ بغیر مقصد کے تو ترقی معکوس، اور حقیقی ارتقار میں امتیاز کرنا ناممکن ہے، اب اس ارتقار کو پرکھنے کے لئے ایک ہی آزمائش کافی ہے، ایسا قدم جو انفرادیت کے حصول میں معاون ہے، ارتقار کا حامل ہے، اور جو اس کے برعکس انفرادیت کو پامال کر رہا ہو، وہ بجائے رفعت کے پستی کی طرف متوجہ ہے، اس طرح ارتقار کے لاتعداد مدارج و منازل مقرر کئے جا سکتے ہیں، انفرادیت کا اصول ایسا معیار ہے جس کے ذریعہ ارتقار کی ہر ایک منزل کو آزما کر دیکھنا لازم ہے، انفرادیت[1] کو معیار ارتقار تسلیم کرنے کے بعد نباتات و حیوانات کے مقابلہ میں ریگ ذرے ارتقار کے سلسلہ میں کہیں پیچھے ہیں، بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا بھی مشکل

[1] ہم یہاں انفرادیت کے مفہوم کو کسی قدر غیر متعین ہی رکھنا بہتر سمجھتے ہیں، انفرادیت فی نفسہ کیا ہے، یہ ایک بہت مشکل سوال ہے، رومی اور اقبال کے موازنہ کے سلسلہ میں انشاء اللہ العزیز یہ سوال تفصیلی طور پر معرض بحث میں آئے گا، فی الحال اس مسئلہ کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں، اور یہاں اتنا ہی کہنا مناسب خیال کرتے ہیں جس قدر کہ جیمس وارڈ نے کہا ہے، اس کے بیانات سے نتائج اخذ کرنا اور نئے نظرت بطور نتیجہ صریح نکالنا دشواریوں کا موجب ہوگا،

معلوم ہوتا ہے کہ وہ انفرادیت کے حامل ہیں، یا اگر ہیں تو کس طرح ہیں، ہاں ارتقائی زینہ کی مختلف سیڑھیوں کو طے کرتے کرتے ہم بالآخر انسان کے وجود تک پہونچتے ہیں، جہاں انفرادیت پوری طرح نمایاں ہے، اور ایک امر واقعی کے طور پر محسوس ہوتی ہے، اور اپنی ذاتی انفرادیت کا احساس کرنے کے بعد ہم دوسرے افراد کی انفرادیت کا بھی اقرار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور اسی احساس کی بنا پر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم حیوانات اور نباتات کو بھی اس ذوق انفرادیت سے محروم نہیں سمجھ سکتے، بلکہ ہم اس پر مجبور ہیں کہ اپنے پر قیاس اہل دہر بلکہ کائنات کو بھی اپنے احساسات کی بنا پر ٹٹول کر دیکھیں، اس صورت میں یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ کائنات میں ہر ایک شے "انفرادیت" کے ذوق سے سرشار ہے، ہاں وہ موجودات جو انسان سے کسی قدر پست ہیں، اگرچہ اپنی جگہ منفرد ہیں لیکن ہمارے برعکس شعور انفرادیت سے عاری ہیں، مگر ان کے لئے شعور انفرادیت ہونا لازم نہیں، اکثر حیوانات بھی اس شعور سے عاری ہیں لیکن با ایں ہمہ منفرد ہیں یعنی بے مثل ہیں وحید ہیں اپنے اپنے ذاتی احساسات، جذبات اور ادراکات کی بنا پر آپ اپنی مثال ہیں،

اب اگر ذوق انفرادیت، ہم میں اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے، تو پھر نباتات اور جمادات کو اس سے محروم تصور کرنا بڑی بے انصافی ہوگی، ہم دیکھ چکے ہیں کہ انفرادیت کے ساتھ ساتھ شعور انفرادیت ہونا لازم نہیں، بلکہ اولی ہے،

اس لئے اب یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ عالم کائنات میں ذوق انفرادیت ہر جگہ جاری و ساری ہے ہر شے اور ہر شخص اسی جذبہ اور ذوق کے ماتحت اپنے اپنے وجود پر قائم اور ارتقائی منازل پر گامزن ہے، ہر ایک ارتقائی منزل زیادہ سے زیادہ انفرادیت کے حصول کی موجب ہوتی ہے، اور بالآخر انسان کے وجود میں پہنچ کر اس جذبہ کی تکمیل ہوتی ہے،[1]

[1] ہم نے اس مضمون میں چونکہ اقبال اور جیمس وارڈ کے نظریہ خودی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے فی الحال یہ سوال نہیں اٹھایا ہے کہ آخر جیمس وارڈ یا اقبال کے نزدیک اس جذبۂ انفرادیت کا تعلق خدا کے وجود سے کیا ہے، یہ

اقبال جیمس وارڈ کے مذکورۂ بالا تمام خیالات سے پورے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں، بلکہ کسی حد تک انہی خیالات کے مرہون منت بھی ہیں، انہی خیالات سے متاثر ہوکر انھوں نے اپنے مخصوص فلسفۂ خودی کی تعمیر کی ہی، ہاں یہ ضرور ہے کہ اگرچہ اُن کے فلسفۂ خودی کی ابتدا اس طرح ہوئی لیکن آگے چل کر اُن کے اور جیمس وارڈ کے درمیان ایک ایسا فرق پیدا ہوگیا ہے جس کی بنا پر اقبال کے نظریۂ خودی کو مخصوص انہی کا نظریہ کہا جا سکتا ہے اور جیمس وارڈ یا نیٹشے یا فشٹے یا کسی اور کا مرہون احسان نہیں قرار دیا جا سکتا، اس سلسلہ میں رومی علیہ الرحمۃ نے ان کی رہنمائی کی ہے، جس کی بنا پر وہ بجا طور پر اُن کو اپنا پیر مرشد تصور کرتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ

"اسرار (یعنی خودی) کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکمار کے افکار اور مشاہدات[1] (ہمارے خیال میں لفظ مشاہدات بہت غور طلب ہی) سے ماخوذ ہے"،

مگر یہ کس طرح؟ اس کی جانب آج تک جہاں تک ہم کو معلوم ہے کسی شخص نے توجہ نہیں کی، اور کسی نے غیر جانبدارانہ طور پر یہ نہیں تبلایا کہ آخر مسلمان صوفیہ اور حکمار کے افکار اور مشاہدات کیا ہیں، اور اقبال کا فلسفۂ خودی کس طرح اُن سے ماخوذ ہے، مولانا عبد السلام صاحب نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے قلم اٹھایا ہے، مگر انھوں نے اس کوشش میں کہ اقبال کا فلسفۂ خودی مسلمان صوفیہ اور حکمار کے افکار اور مشاہدات سے ماخوذ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۷) انشاء اللہ العزیز اگلے مقالہ کا موضوع ہوگا، اور کسی حد تک اسی مقالہ میں اور پوری طرح رومی اور اقبال کے موازنہ کے سلسلہ میں خود اقبال کے اس بیان کی تصدیق ہو جائے گی کہ "اسرار (یعنی خودی) کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکمار کے افکار اور مشاہدات سے ماخوذ ہے"، (اقبال نامہ ص ۴۳، ۴۴) چونکہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب اور مولانا عبد السلام صاحب اقبال کے فلسفۂ خودی کو مسلمان صوفیہ سے حکیمانہ طور پر ماخوذ نہیں کر سکے اس لئے فشٹے کے اثر کو غیر ضروری طور پر تسلیم کر لیا [1] ہماری خیال میں علامہ اقبالؒ اس تحریر میں (جو اقبال نامہ ص ۴۳، ۴۴ پر درج ہے) وحدت الوجود کے فلسفہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، انشاء اللہ العزیز آگے چل کر ہم دلائل سے ثابت کریں گے کہ ایک طرح سے خود اقبال کو بھی وحدت الوجود کا پرزور حامی کہا جا سکتا ہے، اس کی تفصیل اقبال اور رومی کے موازنہ میں آئے گی،

کیا جا سکے، یا مطابقت کر سکے"، مسلمان صوفیہ کے افکار اور مشاہدات کا بالخصوص، اور مسلمان حکمار کے افکار اور مشاہدات کا بالعموم نقشہ ہی بدل دیا ہے، مثلاً مسئلۂ شر، مسئلۂ خودی اور مسئلۂ اختیار کو بھی صوفیائے کرام کے افکار اور مشاہدات کی تائید میں تصور کر بیٹھے ہیں، میری ناقص رائے میں "شر" یا "ذاتی خودی" یا "اختیار" کے تصورات کو صوفیائے کرام کے افکار اور مشاہدات میں زبردستی شامل کئے بغیر بھی اقبال کے اس بیان کی تائید ہو سکتی ہے کہ اقبال کا نظریۂ خودی مسلمان صوفیہ اور حکمار کے افکار اور مشاہدات سے ماخوذ ہے، یہ نکتہ انشاء اللہ العزیز اقبال اور رومی کے موازنہ کے سلسلہ میں پوری طرح واضح کیا جائے گا،

اقبال جیمس وارڈ کی طرح وحدت وجود کے برعکس کثرت وجود کے زیادہ قائل ہیں یعنی کائنات میں باہمہ مماثلت و مناسبت و مشاکلت ہر ایک فرد دوسرے سے ممیز ہو اور ہر ایک شخص دوسرے شخص کے مقابلہ میں منفرد اور وحید ہے،

یہ (زندگی) وحدت ہی کثرت میں ہر دم اسیر ۔۔۔ مگر ہر کہیں بے چگون بے نظیر
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں ۔۔۔ کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

اسی طرح جذبۂ انفرادیت کائنات کی ہر شے کو اپنی اپنی جگہ بے مثل اور یکتا بنائے ہوئے ہے،

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی اک جذبۂ یکتائی

ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض جگہ یہ ذوق انفرادیت بہت نمایاں ہے، اور بعض جگہ در پردہ کارفرما ہے لیکن اس سے خالی کوئی بھی نہیں ہے، انتہا یہ ہے کہ جامد کنکر پتھر بھی اس جذبہ کا حامل ہے، یہ ریگ آدریت ہو کر اپنی انفرادیت کو ختم کرنا قبول نہیں کرتے، یہی صورت انسان کی ہے، جو زوال کے برعکس ریزہ ریزہ ہو کر غیر منفرد ہونا پسند نہیں کرتا،

اقبال کے خیال میں جیمس وارڈ کا یہ خیال بھی درست ہی کہ خود انفرادیت کے بھی مختلف مدارج ہیں،

اور سلسلۂ ارتقا میں جس قدر اوپر جائیے اسی قدر انفرادیت واضح ہوتی جائے گی، اور جس قدر پستی کی طرف نظر ڈالیے اسی قدر وہ مبہم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، یہان تک کہ بعض چیزون کو بظاہر منفرد بتانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے، مثلاً ذرات کے متعلق کون یقین سے کہہ سکتا ہو کہ وہ منفرد ہین، یا غیر منفرد،

جیمس وارڈ کے نزدیک تنزل کی صورت مین جامد اور ٹھوس مادہ کو ایک ایسی حالت مین تصور کیا جا سکتا ہے، جہان یہی نہین کہ انفرادیت مبہم ہو، بلکہ یکسر معدوم ہو، اور ٹھیک اس مقام سے انفرادیت کی جد وجہد کا آغاز ہو رہا ہو[۵۱]، اقبال کے نزدیک جذبۂ انفرادیت کا کسی خاص مقام یا خاص وقت سے آغاز نہین ہوتا، بلکہ یہ جذبہ ازلی اور ابدی ہے، اور عالم وجود مین جس قدر پستی کی طرف بھی جایا جائے، کوئی بھی اس قدر پست مقام نہین ملے گا، جہان کسی وجود کو جذبۂ انفرادیت سے قطعی طور پر عاری کہا جا سکے[۵۲]،

ہر چیز ہے محو خود نمائی	ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت	تعمیر خودی مین ہو خدائی

از سر تیشہ گذشتن ز خردمندی نیست	اے بسا لعل کہ اندر دل سنگ است ہنوز

بہ نگاہ آشنائے چو درون لالہ دیدم	ہمہ ذوق و شوق دیدم ہمہ آہ و نالہ دیدم

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا	پودون کو بھی احساس ہو پہنائی فضا کا
ظلمت کدۂ خاک مین شاکر نہین رہتا	ہر لحظہ ہے دانہ کو جنون نشو و نما کا

---

۵۱ کثرت اور توحید از جیمس وارڈ ص ۴۳ ۵۲ یہ اختلاف رائے ان دونون کے خدا کے نظریہ مین بھی اختلاف کا موجب ہوا ہے جو انشاء اللہ العزیز اگلے مقالہ مین واضح کیا جائے گا، اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، اقبال کے لکچرز صفحات ۳۰، ۳۷، ۱۰ اور ۹۰، جہان مادیت کی تردید کی گئی ہی،

اس کے معنی یہ ہین کہ ساکت، جامد، غیر متحرک، اور وغیر ذی شعور مادہ بھی کسی نہ کسی طرح کسی درجہ کے احساس خودی کا حامل ضرور ہے[۵۳]،

اقبال اور جیمس وارڈ مین ایک اور بھی بنیادی فرق ہے جس کی بنا پر جیمس وارڈ اپنی مخصوص منزل خیال تک پہونچ کر آگے نہ بڑھ سکا، لیکن اقبال مسلمان صوفیہ اور حکماء کے افکار اور مشاہدات[۵۴] کی روشنی مین نئی بلندیون کے ذوق مین آگے بڑھتے ہین،

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہین جیمس وارڈ یہ ضرور کہتا ہے کہ انفرادیت کا ذوق عام ہے، ہر ایک شے اس کے حصول کے لئے کوشان ہے، لیکن آخر اس انفرادیت سے کیا مقصود ہے، اور اس کی کیا تعریف ہے؟ یہ جیمس وارڈ صاف طور پر واضح نہین کرتا،

یہ ضرور ہے کہ گو اس لفظ کے معنی متعین نہین کیے گئے ہین، پھر بھی اس فروگذاشت کا جیمس وارڈ کے فلسفہ پر کوئی خاص اثر نہین پڑتا، بلکہ ایک حد تک اس کے لئے یہی مناسب تھا کہ اس لفظ انفرادیت کے معنی مبہم ہی چھوڑ دیئے جائین، کیونکہ اگر اس کی وضاحت کی جاتی تو شاید انفرادیت بھی مشترک خصوصیات کا مجموعہ قرار پاتی، لیکن اگر انفرادیت کو مشترک خصوصیات کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی جائے، تو انفرادیت کے مفہوم مین جو یکتائی مضمر ہے وہ ختم ہو جاتی ہے، یعنی اگر انفرادیت کو عام خصوصیات کے ذریعہ تصور کیا جائے، (اور ہمارے لئے اس کو سمجھنے کا یہی واحد ذریعہ ہو سکتا ہے) تو پھر انفرادیت کہان باقی رہتی ہے؟ اس حالت مین تو یکتائی کے بجائے یک رنگی کا اقرار لازم آتا ہے،

اقبال نے بہت جلد محسوس کیا کہ اس قسم کی انفرادیت جو ہر فرد کو دوسرے فرد سے انتہائی طور پر غیر متعلق اور غیر منسلک بنانے مین معاون ہو، بہت سے خطرناک نتائج کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے، اور اس

---

۵۳ الہیات اقبال مین مصنف نے اس نکتہ کی سیر حاصل طور پر وضاحت کی ہے، مادہ کا بیان ملاحظہ ہو،
۵۴ اقبال نامہ ص ۴۳، ۴۴،

قسم کی انفرادیت کی گنجائش راہبانہ طرز زندگی مین تو شاید کسی طرح نکل سکے، لیکن اسلام مین جو ایک معاشرتی نظام فکر و عمل ہے، اس قسم کی انفرادیت کو کسی طرح بھی قابل قبول تسلیم نہین کیا جاسکتا اقبال کا خیال ہے کہ اسلام انفرادیت کی ضرور تائید کرتا ہے لیکن اس طرح کی یکرنگی بھی پیدا ہو سکتی ہی معنی ہیں تخلقوا باخلاق اللّٰہ کے یعنی اللہ کا سا اخلاق پیدا کرو، یا صبغۃ اللّٰہ یا مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہ صبغہ کے یعنی اللہ کا رنگ سب سے بہتر ہے،

ایسی صورت مین اسلام کو انفرادیت کے فلسفہ سے کس طرح ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے، اقبال عرصہ تک اسی غور و فکر مین پڑے رہے، اور تجسس کی راہین بدلتے ہوئے، ایک عرصہ کے بعد وہ اس کوشش مین کامیاب ہوئے، یہ اقبال کی دنیائے اسلام کے لئے وہ عظیم ترین خدمت ہے، جو دم پیران شرق[۵۱] کی مرہون منت ہے، اور جو ان کو "فرنگی جوانان مثل برق[۵۲]" سے جو گوئٹے[۵۳] سے متعلق ہی تمیز کئے ہوئے ہے،

اسلام (جو انفرادیت کے برعکس معاشرت کا زیادہ حامی ہے) اور انفرادیت کے مذکورۂ بالا فلسفہ مین یہ ہم آہنگی اور مطابقت دو طرح سے پیدا کی گئی ہے، ایک اس طرح کہ اسلام کو جسے اقبال خود بھی ایک معاشرتی نظام تصور کرتے ہین، خودی اور انفرادیت کا پرورش کرنے والا بتایا گیا ہے، مثلاً اپنے چھٹے خطبہ مین اسلام کے متعلق لکھتے ہین :-

"اسلام ہر فرد کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، افراد مین یگانگت اور یکرنگی پیدا کرنے کے لئے کسی خونی تعلق کو جو ایک ارضی واسطہ ہے تسلیم نہین کرتا[۵۴]"،

اور بہت سی جگہ اس قسم کے اشارات ملتے ہین، مثلاً زبور عجم مین لکھتے ہین :-

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو

---

[۵۱] پیام مشرق ص ۲ [۵۲] ایضاً [۵۳] ایضاً [۵۴] اقبال اور گوئٹے کا موازنہ بھی کسی آیندہ مقالہ مین پیش کیا جائیگا، [۵۵] لکچرز ص ۱۳۹،

یا ایک جگہ نبوت کے لئے لکھتے ہین، کہ

وہ نبوت ہے مسلمان کے لئے برگ حشیش
جس نبوت مین نہین قدرت و شوکت کا پیام

ہر ایک دین کے لئے اُن کا یہی خیال ہے کہ اگر دین سچا ہے، تو خودی کا محافظ ہوگا، مثلاً پس چہ باید کرد مین تحریر کرتے ہین :-

فاش می خواہی اگر اسرار دین
جز بہ اعماق ضمیر خود مبین

کس نگردد در جہان محتاج کس
نکتۂ شرع مبین این است و بس

تا تہ و بالا نگردد این نظام
دانش و تہذیب و دین سودائے خام

وارد (حق) اندر سینۂ تکبیر اُم
درجبین اوست تقدیر اُمم

فقر قرآن احتساب ہست و بود
نے رباب و مستی و رقص و سرود

فقر مومن چیست تسخیر جہات
بندہ از تاثیر او مولا صفات

اب جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہین، اگر ہر فرد اپنی خودی ہی کی نگہداشت، پرورش اور بالیدگی ہی مین مصروف رہے گا، تو اسلام جس معاشرتی نظام کا حامل ہے، وہ صحیح طور پر فروغ نہین پا سکتا، اس لئے ایسی خودی کے فلسفہ کو جو بنہایت انفرادیت کا حامل ہے، معاشرتی نظام سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے اقبال نے اس کی ایک بے مثل سبیل پیدا کی ہے، جو خودی کے فلسفہ کو اسلام سے ہم آہنگ بنانے مین دوسرا قدم ہے، اس مین اقبال نے یہ کوشش کی ہے کہ خودی کے معنی کو حکمائے مغرب کی نگاہون سے نہ متعین کیا جائے، بلکہ مسلمان صوفیاء اور حکماء کے مشاہدات و افکار کی رو سے اس کے معنی مین ایسی توسیع کی جائے، کہ حکمائے مشرق و مغرب دونون ایک دوسرے سے اس قدر ہم آہنگ ہوجائین کہ جو نقص یا کمی ایک کے نظام فکر مین ہو اس کی تلافی دوسرے کے فلسفہ سے ہو سکے،

خودی کے فلسفہ مین جو جو اجزاء مغرب سے ماخوذ ہین، وہ پچھلے مقالون مین زیر بحث

آچکے ہین یہان پر بطور یادداشت کے اجمالاً پھر سے لکھے جاتے ہین،

۱۔ خودنمائی اور خودافزائی عالم کی فطرت ہے، اور خود اسی بنیادی فطرت کا مظاہر ہے، عالم مین ہر شے اسی جذبہ کی حامل ہے، یہ جذبہ صرف انسان ہی تک محدود نہین ہے، (ماخوذ از لی بینز ویزہ Leibnitz)

۲۔ مصائب، مشکلات اور مزاحمت کا مقابلہ کئے ہوئے بغیر دنیا مین زندہ رہنا ناممکن ہے، یعنی قیام وجود کے لئے یہ لازم ہے، کہ خودی کا احساس پرورش پائے، اور فروغ حاصل کریگا،

(ماخوذ از نیطشے)

۳۔ خودی کا سب سے اہم اور نمایان مظاہرہ قوت، شوکت، اور جبروت مین ہوتا ہے، (ماخوذ از نیطشے)

۴۔ خودی کا احساس غیر خودی کی موجودگی ہی مین بآسانی پیدا ہوسکتا ہے، اور زیادہ قوی ہوسکتا ہے، ورنہ غیر خود کی عدم موجودگی مین خودی کا احساس پیدا ہونا کسی قدر دیرطلب ہوگا، اور یہ احساس بھی کچھ بہت قوی نہ ہوگا، (ماخوذ از فشٹے)

۵۔ خودی کی بالیدگی اور پرورش اور اس کا صحیح احساس پیدا ہونے کے لئے دوسرے اشخاص کی خودی کا بھی اقرار کرنا واجب ہی، (ماخوذ از جمیس وارڈ) ورنہ یہ جذبہ گمراہ کن ثابت ہوگا، جیسا کہ نیطشے کے حق مین ہوا،

یہان تک اقبال کسی حد تک مغرب کے مرہونِ منت ہین، لیکن خودی کے فلسفہ مین ایک مخصوص جزو ایسا بھی ہے، جو مغرب کے بجائے حکماے مشرق اور صوفیاے کرام کے مشاہدات اور افکار سے ماخوذ ہے، یہی وہ جزو ہے جو اقبال کو مغرب سے غیر متعلق کرکے پیر روم کا گرویدہ بنائے ہوئے ہے، اقبال اور رومی کا موازنہ انشاءاللہ العزیز کسی اگلے مقالہ کا موضوع ہوگا، وہان یہ نکتہ

واضح ہوگا کہ خودی کا تعلق خدا سے بھی ہے[۱]، خدا کے اقرار کے بعد خودی اور خدا کے تعلق کو متعین کرنا مغربی فلسفہ خودی کو مسلمان صوفیاء اور حکماء کے مشاہدات اور افکار کے تابع بنا دیتا ہی، یہی اقبال کی وہ مایۂ ناز کامیابی ہے، جو اگر ایک طرف حکماے مغرب کے لئے مایۂ ناز ہے تو دوسری طرف حکماے مشرق کے لئے بھی قابل فخر و مباہات ہے،

(باقی)

---

[۱] جمیس وارڈ نے بھی اس تعلق پر روشنی ڈالی ہے، لیکن اقبال اس سلسلہ مین بجائے جمیس وارڈ کے رومی علیہ الرحمۃ کی تائید کرتے ہین، خدا کے نظریہ مین اقبال اور جمیس وارڈ مین کیا اختلاف رائے ہے، یہ انشاءاللہ العزیز اگلے مقالہ مین واضح ہوجائے گا،

کرم خان رامپوری اور ان کا کلام

از

جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری

(۲)

دلی کا ایک مشاعرہ کرم خان دلی کے ایک مشاعرے کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہین کہ جمادی الاول سنہ ۱۲۳۲ھ مین مجھے دلی کے ایک مشہور مشاعرے مین شرکت کا اتفاق ہوا، مقام مشاعرہ شعراء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، دلی اور دوسرے مقامات کے کثیر شعرا موجود تھے، دلی کے کچھ شاعر ایسے بھی تھے، جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے، جب مین شاہ نصیر دہلوی کے پاس جاکر بیٹھا تو ان کی عداوت کی آگ اور دونی ہو گئی، چنانچہ مخالفین مین سے ایک شاعر نے ذریعہ شعر مجھ پر پھبتی کسی،

مرا در ملک ہند اے دوستان افسوس می آید
کہ با مرغ چمن دعوی کنان طاؤس می آید

یہ سنتے ہی مین نے فی البدیہہ جواب دیا،

بہندم حیرتے زین شیوۂ معکوس می آید
کہ فوج زاغہا رقصان بر طاؤس می آید

اس جوابی شعر نے مخالفین کے منہ کیل دیئے،

اب کچھ سادہ کلام سنیئے :-

ہم بڑے تم سے ہون کسی کے لئے
آہ کے دن کی زندگی کے لئے

خاک ڈالی بھون کے ملنے پہ
صرف اک تیری دوستی کے لئے

رات ہنس بول کر ہمین کاٹو
اپنے مغموم کی خوشی کے لئے

عشق کا نام نہ لو جانے دو
اس مرض سے ابھی ہم جیتے ہین

بولے وہ عکس لب اپنے کا آپ
بوسہ آئینہ مین ہم لیتے ہین

نہ محبت نہ مروت نہ وفا
جانیئے کیون تجھے چاہا ہم نے

کیون اٹھایا ہے مفت کا جھگڑا
آپ قاضی ہین یا کہ مفتی ہین

لو چلے ہم سلام لو، اللہ!
کیا ہمین ایسا ویسا جانا ہے

بات کرنے مین لگتی ہے تہمت
اے کرم کیا بُرا زمانا ہے

غیر سے لاگ لگاؤ جاؤ،
چلتے پھرتے نظر آؤ جاؤ،

چھو لیا گال تو کیا قہر ہوا
خیر سے منہ نہ بناؤ جاؤ

داغ اور بھی تازہ ہوگا
پھول سا منہ نہ دکھاؤ جاؤ

اے کرم آپ بھلے ہین تو بھلا ہے سب جگ
گر بُرا سمجھین کسی کو تو ہمین خوب نہین

بس جی بس بس، اجی بس بس، اجی بس بس بس بس
بس جی بس بس اجی بس چین جبین خوب نہین

لگ تو تیر ہے یہ بھی نہین تو تکتا ہے
تم اس کو نالہ دل بھی کرم سنا دیکھو

حاصل نہ ہوا یار کا پابوس صد افسوس
افسوس صد افسوس صد افسوس صد افسوس

کہہ سنا یار کو فسانۂ غم
دل ناشاد ہر چہ بادا باد

پی گئے سے بقول جامی سب
پیجئے گا ہر چہ بادا باد

چل کے بس رہ گئی مین اکی کرم
خانہ آباد ہر چہ بادا باد

شیشہ ہے مے ہے وہ ساقی نہین میخانے مین
گھول کر زہر پلا دو مجھے پیمانے مین

یہ تو ہر آن کلیجہ ہی کو لیتی ہے مروڑ
کیا ادا ئین ہین کمر کے ترے بل کھانے مین

دولت سرا کو آپ تو تشریف لے چلے
تعظیم کرکے ہم کو بٹھانا ضرور گیا

تسکین دل کو میری شبِ ہجر میں کوئی
مشفق نہ تھا شفیق نہ تھا مہربان نہ تھا

پٹکا کیا میں سر کو اکیلا زمین سے رات
کرنے کو سرزنش بھی کوئی بدزبان نہ تھا

آنکھیں ذرا اٹھائیں ادھر کو اے کرم
شب جس جگہ کہ آپ تھے کیا میں وہان نہ تھا

کل کرم خان کی کری محفل میں تعظیم اس نے جب
سرو قد اٹھ کر کہا حضرت سلامت آئیے

چلا میں خفا ہو چلے مت زیادہ
اجی خانہ آباد و دولت زیادہ

مساوی ہے اس کی ملاقات ہم سے
نہ رنجش زیادہ نہ الفت زیادہ

تلطف، نوازش، کرم، مہربانی
مرے حال پر ہے عنایت زیادہ

لگ گیا اس پری سے جی ہی تو ہے
آگئی طبع آدمی ہی تو ہے

بے تکلف ہو گیا وہ ہم سے بھی
کہ ملاقات سرسری تو ہے

کب تک اس سے بچا رہیگا کرم
دیکھ لیں گے تو ہاں ولی ہی تو ہے

متفرق غزلوں کے چند اشعار:-

گرنے سے تھم گیا مری نالے کے ڈر سے چرخ
ہر کہکشان سے ہاتھ میں اسکے عصا ہنوز

درِ جانان پہ گیا اب تو قدم جم اپنا
رتبہ ہے خاک نشینی میں بھی جون جم اپنا

خانۂ چشم میں قربان ہے تصور کے ترے
صورتِ قبلہ نما دیدۂ پرنم اپنا

میرے نالوں سے کرم صورتِ دستِ رعشہ
لنگرِ عرشِ معلیٰ کے ہلے جاتے ہیں

ہم جو شنی فائدہ سے ان کی ہیں محروم
وا ہوئے خوش خوانی منعم بھی لب اپنا

بیٹھے بیٹھے [illegible]
وہ [illegible] کر ہمارا قصۂ غم بادہ خواری میں

دنیا سے وہ گیا [illegible] بار گیا ہو
دریائے معرفت کا جو کوئی آشنا ہو

روشن دونوں کو تن کی زینت سے کام کیا ہے
مشعل کو دیکھو اس کا کیا جامہ تیلیا ہے

آزاد ہو گیا ہوں میں قید سے جہان کی
راز الٰہ مجھ پہ جب سے کہ کھل گیا ہے

زبان دراز ہو تم اور کرم ہے نازک طبع
نباہ کی کوئی صورت نہیں سخن کوتاہ

بن میرے نہ اوروں سے کرو پیار کی باتیں
ہر ایک کے حصے میں یہ سوغات نہ جاوے

ہوتا ہو سو ہو عشق سے تو اس کے نہ باز آ
سر جاوے کرم دیکھیو پر بات نہ جاوے

آپس میں دونوں ہنس پڑے جو ہم لڑ گئی جو آنکھ
ہم ان کے منہ کو تک رہے وہ ہم کو تک رہے

وہ ترچھی آنکھیں بنا بنا کر غضب سے ہونٹوں میں مسکرانا
سکوڑ کے بیٹھا ہے دونوں مونڈھے حیا سے گردن رہا جھکا کر

غزل اک عاشقانہ پڑھ سنا و اہلِ محفل کو
یہ سب مشتاق بیٹھے ہیں ذرا کہہ دو کرم خان سے

کھڑا ہوتا ہوں سننے کو میں اس کی میٹھی باتوں کے
لگائے کان پہروں اس کی دیوارِ شبستان سے

اب ردیف و قافیہ مجہول کر کے کہہ غزل
یہ زمین تو اے کرم بہتوں کی ہے چھانی ہوئی

اس کے کوچے میں نہ جا دل یہ برے لچھن ہیں
جانیے کیا ہو کہ سو دوست ہیں سو دشمن ہیں

دیدوادید کے ہم دن میں اڑاتے ہیں مزے
گھر کی دیوار میں اس کی جو کئی روزن ہیں

لبوں پہ اپنے ذکر منحزین یار رہتا ہے
اسی ہائے دو چشمی کا سبق ہر بار رہتا ہے

اسکے غم میں سوؤں گا کفن پیرہن میں چادر تان کے
معنی النوم اخ الموت جی میں ٹھان کر

اس زمین میں اک غزل ایسی ہی کہہ تو اے کرم
رکھیں سر آنکھوں پہ جس کو سب تبرک جان کر

دل کب اس زلف سے اے شانہ جدا ہوتا ہے
ناخنوں سے بھی کبھی گوشت جدا ہوتا ہے

سوچ ہی میں مجھ کو گذری ہے کرم دن اور رات
جس طرف دل ہے ادھر دھیان لگا ہوتا ہے

کشتہ ہوتے ہیں اس ترک ستمگر کے ہم
داخل ہوئے شہیدوں میں لو ہو لگا کے ہم

کون غنچہ وہاں آکے گیا پی تپان
بوئے گل سے نہیں کم بوئے گل قبا کو

اس شب تار مین اب اور یہ ڈال کرم
تا دہر شہر مین لو لوٹے گل مہتاب کو

عزت کریم بڑی یون تو ہو خوبیوں میں مری
پر یہی ڈر ہے کہ لوگون مین نہ بے عزت ہون

نقش دیوار ہون مین با قدم اس کے حضور
اے کرم بے خبری مین بھی مین باخبرت ہون

غلام محی الدین بنگ خوار کی فرمایش

ہر غلام محی دین اک طرفہ کس
اللہ اللہ کیا بہادر ہے کہ بس

جب چڑھے ہے نشہ بنگ وچرس
ڈالے ہے چٹکی مین مل اڑتی مگس

سراپا نگاری | محبوب کے سراپا کی تصویر تین حصون پر تقسیم ہے، اور ہر حصہ کے لئے ایک ایک غزل مخصوص ہے، پہلا حصہ سر سے گردن تک ہے، دوسرا گردن سے کمر تک، تیسرا کمر سے پاؤن تک، مین دوسرے اور تیسرے حصہ کے کچھ شعر پیش کرتا ہون، فرماتے ہین:-

ہے یہ زمین مرغوب طبیعت اور غزل کہہ بیس کرم
گردن تک اب نیچے ڈھل چل، گر کچھ زور طبیعت ہو

پتلی پتلی انگلیون پر ہے مہندی گنڈیری دار خضب
گوری اس کے ہاتھ ہین، تس پر قہر حنا کی رنگت ہو

رکھتی ہے پشت نازک اس کی کیا ہی نزاکت اور نرمی
تکیہ زنی ہو بالش گل کی جس کو نہایت نفرت ہو

ایک غزل کہہ اور کرم تو، تا یہ سراپا پورا ہو
باقی ہے دھڑ کا آدھے دھڑ کا گو، دھوم فراغت ہو

ناف ہو اس کی چشمۂ خوبی جس سے جی کو طراوت ہو
پیٹ ہو تختہ نور کا، پیڑو، قبہ قصر جنت، ہو

ایسی صفائی رکھتے ہین زانو کہ جن پر نظر
دیدۂ عینک، دید سے اُن کی غرق مجسم حیرت ہے

چوٹی سے لے ایڑی تک وہ نمک سنگ مین ہو ٹھیک کرم
حسن مین اُس کے پشت پا کو دے جان پہ سبقت ہو

ایک خواب | یہ تو آپ نے اوپر ملاحظہ ہی فرما لیا ہے، کہ کرم خان کے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جو تولد ہی فوت ہو گیا، اور انھین تاریخ لکھنا پڑی،

تو تولد پسر ہوا میرا
بدلے شادی کے ہو گیا ماتم

رو کے مین نے قلم دوات اٹھا
اس کی تاریخ کی دریغ رقم
۱۲۱۴ھ

اس بچے کے مرنے کے بعد سے وہ دوسرے بچے کی آرزو مین بے چین رہتے تھے، دماغ میں ہر وقت یہی خیال سمایا رہتا تھا، جس کا ظہور خواب مین ہوا، لیکن وہ خواب بھی خواب پریشان ہی ثابت ہوا، اس واقعہ کو بڑی روانی اور درد و حسرت کے ساتھ نظم کیا ہے،

رات اُس بن مجھے آتا تھا چلا رونا سا
صحن خانہ مجھے لگتا تھا بن اک اجڑا سا

دار تھا گھر مجھے، پر آئی ہے سولی پہ بھی نیند
سو گیا مین جو ہوا خواب کا کچھ غلبا سا

دیکھی یہ خواب کہ منگنی ہوئی ہے اس سے مری
جس پہ برسون سے گیا ہے مجھے دیوانا سا

کھا لیا پان بھی اور پہن لی چھاپ انگلی مین
پانی رد دال بھی، شربت بھی پیا میٹھا سا

خواب ہی مین ہوئی القصہ مری پھر شادی
بس گیا اس دل ناشاد کا گھر سونا سا

گنجفہ کھیلتے تھے گاہ، گہے تختہ نرد
دونون ہم بیٹھے کیا کرتے تھے مشغولا سا

جوڑے محمودی و خاصہ کے پہنتے تھے ہم
اور کھانے کو بھی کھاتے تھے کچھ اک نعمتا سا

گوشت حلوان کا اور خاص خمیری پھلکے
طاہری افرنی و حلوا بھی تر و تازہ سا

روز بریانی و بورانی و باقر خانی
دونون ہم ساتھ ہی کھاتے تھے یہ کچھ کھانا سا

بعد یک سال عجب دل کی اُنا ہی نکلی
یعنی لڑکا مرے پیدا ہوا اک گورا سا

میری سسرال مین چھوچھک کی ہوئی تیاری
اور رکھا ڈھول، ہوا گانون لگا گانا سا

آکے مُلانے بھی پھر کان مین دی اُسکے اذان
دیکھ قرآن مین اک نام رکھا اچھا سا

اور تاریخ کہی اس کی کرم یون مین نے
بیٹا اے واہ ہوا چاند ہی کا ٹکڑا سا
۱۲۲۴ھ

کھل گئی آنکھ تو نے وہ تھی نہ لڑکا نہ وہ عیش
جھونپڑا تو مگر اک باقی تھا ہان ٹوٹا سا

کرم خان بحیثیت سپاہی فوج مہاراجہ ہلکر کی فوج میں :-

اُن کی پلٹن کے میجر شیخ نہال تھے، اُن سے اَن بن رہتی تھی، جب مجبور ہو گئے، تو ہجو کی صورت میں دلی بخار نکالا،

کیجے میجر کی خوے بد کو خیال   ہانڈی کھلواتی ہی اونٹ نی لال

کوچ میں تا نہ میری پکے دال   شکر ہی ہانڈیوں کا پڑتیں کال

شجرِ بے ثمر ہے شیخ نہال

کیا کوئی خاک اس سے ہوگا نہال

ہانڈی کھلوا دی میری جانے کیوں   اس سے فرمانا تھا اونٹ کیا بوجھوں

یہ میں کہتا ہوں صاف حق تو یوں   دیکھ جلنے جو ہوں تو ویسے ہوں

شجرِ بے ثمر ہے شیخ نہال

کیا کوئی خاک اس سے ہوگا نہال

دال سالن اگر خود ہمرہ نان   بھیجے تو ضعف سے خاطر اسکی گراں

ہووے درد کمی تو بھجواں بلا کر یہاں   ہنس ہنس کے کہتا ہے یوں کہ نوشِ جان

شجرِ بے ثمر ہے شیخ نہال

کیا کوئی خاک اس سے ہوگا نہال

کرم خان کی تعیناتی کوٹے میں ہوتی ہے، وہاں کا پانی اُن کے حق میں سم قاتل ثابت ہوتا ہے، جس کی مذمت اس طرح کرتے ہیں

یہاں پہنچا یا قدم کوٹے میں دھر کے   بچا پانی سے یاں کے یعنی مر کے

نہیں رکھتا ہے کیفیت یہ پانی   شکم میں ناج کرتا ہے گرانی

جو کیڑا پیٹ میں کوئی پڑے ہی   تو جوں سنگ آگے چھاتی پر اڑے ہی

جوان جو جو کہ تھے چالاک اور چست   انھیں پانی نے یاں کے کر دیا سست

پیے گر خضر آکر یاں کا پانی   تو پھر آخر ہے عمرِ جاودانی

دہن جب مشک کا سقے نے کھولا   سبوے آب میں بس زہر گھولا

بھلا وے یاں کے گر پانی میں تلوار   نہ مانگے اُس کا بار آب زنہار

تم اُس پانی کے کپتے بھر کے لے جاؤ   جہاں چاہو بجاے تیل کے جلاؤ

نہ آیا آب و دانہ مجھ کو ناگاہ   نہ تھی پانی کی یاں کے ورنہ کچھ چاہ

عبث یہ شب کو ہیں روغن کے محتاج   جلیں پیشاب سے اُن کے چراغ آج

گلے سے جس کے اترا آب چنبل   ہوا سست اور گیا اُس کا اکڑ بل

تپ و لرزہ کا جاوے ستیاناس   بدن میں مطلقاً چھوڑا نہیں ماس

کرم موقوف کر اب اس سخن کو   یہی کہہ یا خدا لے چل وطن کو

مثنوی در توصیف مکا،

اسی زمانہ میں کرم خان کے تعلقات دلیر خان سے ہو جاتے ہیں، وہ تحفۃً انھیں مکا کے بھٹے بھیجتے ہیں، جس کے شکریہ میں ایک مثنوی پیش کی جاتی ہے، جس میں دلیر خان اور اُن کے بھٹوں کی تعریف نادر تشبیہات اور دلپذیر پیرایے میں کی جاتی ہے،

کوٹے کی جوار ہے کیا شیریں   طرفہ نبات روے زمیں

گو جان کے ہم ہمسر بار   کرتے ہیں طوطیٔ کند وے جوار

بھٹے ہیں اس کے وہ شیریں   خوشۂ انگور ایسے نہیں

بھٹوں سے ہے اس کے عیاں   خندۂ دندان زیب بتان

دانہ اس کا اے ناداں   دانۂ دُر ہے کرنے کو دان

کیوں نہ ہو ڈریاں ارزاں آج | جب ہو مہاراجہ کا راج
غور سے تو بھی آنکھیں کھول | بکتے ہیں موتی جوار کے مول
جس نے نہ کمائی، کھائی چوک | دیکھے سے اُس کے بھاگے بھوک
جگ جگ جیوے دلیر افغان | خان بہادر عالی شان
خوانِ کرم سے جس کے کرمؔ | کھاتے ہیں یہ کچھ نعمت، ہم
چلتے ہیں سب اُس کی لیکھ | سیکھا سیکھی پڑوسن سیکھ
اُس کی بدولت ہر میوہ | کھا کے مٹھائی اور میوہ
کھیلے ہے بڑھی سر سے دھمال | باسی کڑھی میں آیا اُبال
سچ ہے کہ جاؤ پوت دکن | وہی کرمؔ کے ہیں پچھن
تیل نہ نو مَن ہووے گا | اور نہ نا چے گی رادھا
چینی پہ ڈھلتی پھرتی چھاؤن | چلتی کا ہے گاڑی ناؤن
جس نے کہ پکڑا اس کا در | زیست ہوئی عشرت میں بسر
کھا کے نمک ہو جو باغی | ہے وہ غلام اس کا داغی
بارہ برس سے زائد کی | دلّی میں گلخن افروزی
ایسا جب کہ ولی اللہ | ہووے ہمارا پشت و پناہ
ڈالیں نہ کیوں دشمن کو مسل | کودے ہے بچھڑا کھونٹے کے بل
لئے اب اس سے وقتِ سفر | آدین نہ آدین کس کو خبر
کرمؔ کی طبیعت ہے خراب | کس بہتے پر تتا آب
کھچڑی کھائی دن بہلائے | کپڑے پھاڑے گھر کو آئے

ہووے جب اپنا من چنگا | تو ہے کٹھوتی میں گنگا
اس سے سوا اب کیا کہیئے | سب سے بھلی چپ چپ رہیئے

غرض کرم خان ملازمت چھوڑ کر وطن کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور رقم پاس نہ ہونے کی وجہ سے راجہ دھرمداس اکبرآباد کی تعریف میں، اشعر بزبان فارسی لکھ کر پیش کرتے ہیں،

محب اہل فقر و مرجع الناس | سرنام آوران راجہ دھرمداس
سخاوت کرد مشہورش بدوران | بہ ہندستان بہ ترکستان بہ ایران
چو کوسِ جود اُو، آواز در داد | ز گنج آباد گردید اکبر آباد
مسافر ہستم و غرض است زان شاہ | کہ در غربت ندارم توشۂ راہ
رسیدن دور و در ہم در گرہ نیست | جو بشنیم نشستن نیز بہ نیست
دعا کن اے کرمؔ در حق ممدوح | کہ راہ تازہ یابد غنچۂ روح

غرض زاد راہ کی رقم لے کر کرم خان رامپور آجاتے ہیں، اور کوٹے کے پانی کے اثرات ضیق النفس کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، اور دو سال بیمار رہ کر شاہ نصیر دہلوی سے ایک سال پہلے یعنی ۱۲۵۳ھ ہجری میں یہ چہچہاتا ہوا بلبل ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے، اور اس کا گایا ہوا نغمہ اس کے حال کا مصداق بن جاتا ہے،

خاک میں مل ہی گیا موت کے ہاتھوں سے کرمؔ
کیا ہوئی حیف وہ صورت وہ جوانی اُس کی

مثنوی درہجو عورتِ فاحشہ | یہ مثنوی اصلاحی اور اخلاقی ہے، جس کی ابتدا کے چار شعر یہ ہیں،

میرے ہمسایہ میں بھی اک فاحشہ عورت رہتی ہے | شعر کہوں کچھ ہجو میں اُسکی جی میں یہی اب آتی ہے
بیضے ظاہر میں ہیں فقیر اور باطن میں شیطان کے پیر | مکر و فریب و زر دریں خلقت دلّی کی کر کھاتی ہے

دیکھو گردشِ گیتی ہم کو کیا کیا رنگ دکھاتی ہے — دروازے پہ امیروں کے ناداری ہم کو پھراتی ہے
میں ہی نہیں اک تنہا مفلس اس کنگال زمانے میں — مانگے تانگے اب اک خلقت اپنا پیٹ چلاتی ہے

مخمس دردِ پا کا پہلا بند :-

ایسی ہوا چلی ہے کہ نالاں ہیں سب حبیب — بائی کے دکھ سے پاؤں ہلاتے نہیں غریب
نعلوں میں داب داب کے چلنے لگے غریب — عاری ہوئے ہیں اس کی دوا سے سبھی طبیب

بائی کا درد ہو وے نہ دشمن کو بھی نصیب

اب چند رباعیاں تاریخیں، اور حقے کی تعریف میں اشعار ملاحظہ فرمائے جائیں :

رباعیاں

دشمن کو کوئی اقربا کا ثانی نہ ملے — خور رنج، نشاط و شادمانی نہ ملے
حق پوچھیے اے کرم تو ان اپنوں کو — واں ماریئے جس جگہ کہ پانی نہ ملے

بیمار ہیں ہم تمہارے جی میں کیا ہے — تاخیر ہماری دلدہی میں کیا ہے
آپہنچو شتاب اب گھڑی میں گھڑیال — اے بندہ نواز آدمی کیا ہے

وہ قادر بے نیاز چاہے سو کرے — پامال کرے سرفراز چاہے سو کرے
سونپا ہے اسی کو کام اپنا ہم نے — مالک ہے وہ کارساز چاہے سو کرے

تاریخیں

تاریخ رحلت مولوی قدرت اللہ شوق،

قدرت اللہ شوق شد بہ عدم — خفت در مہدِ گور با عشرت
شعرا گشتہ اند در غمِ او — مجمع درد و محفل حسرت
شاعری مردہ شد ز مردن او — شعر بے قدر گشت و بے قیمت
من کہ شاعر ز شوق او شدہ ام — زدہ ام بر دلش سر منت
فاش گویم کرم بتاریخش — گو بہشت شوق مولوی قدرت
۱۲۲۴ھ

دوسری تاریخ :-

تھے بسکہ خلائق کے کرم نور نظر شوق — تاریخ وفات ان کی ہوئی "دم آخر دیدہ"
۱۲۲۴ھ

تاریخ وفات میر عشرت :-

افسوس کہ عہد میں ہمارے — عشرت کی بھی جان تھی غنیمت
خوش فکر، دقیقہ رس، سخن فہم — ذی ہوش، ذہین، اہلِ فطرت
پر بادِ ت ناتمام کی ختم — جس سے ہوئی شاد روحِ عبرت
لے خامہ کرم نے اس کی تاریخ — لکھی یہی "ہائے میر عشرت"
۱۲۳۶ھ

تاریخ وفات نواب سید غلام محمد خان بہادر :-

ز دنیا سوے خلد رحلت نمود — چو نواب حاجی بیت الحرام
ریاضِ جنان گشت آرام گاہ — بسالش خرد گفت "غفران مقام"
۱۲۳۸ھ

تاریخ درخت شہتوت :-

توت کا پیڑ جو آقا نے ہمارے بویا — اس کی "تاریخ ہو شہتوت گلابی میوہ"
۱۲۳۵ھ

حقہ کی تعریف

کرم خان کو حقے سے بے حد شوق تھا، جس کی تعریف میں انہوں نے چند شعر کہہ کر حق رفاقت ادا کیا ہے، نادر تشبیہات قابلِ ملاحظہ ہیں :-

حقہ ہے محبوب بزمِ اہلِ ہوش — جس پہ دم دیتا ہے ہر اک حقہ نوش
شبنم آبِ صفا سے سر بسر — غسل پاتا ہے یہ جوں گل ہر سحر
گڑ گڑاہٹ اس کی ہے وہ لحنِ نغم — گنگری سے جوں گلوے نغمہ ساز
اہلِ محفل کو نہیں اس بن قرار — ہمدم دلسوز ہے اور یار غار
دم میں لیتا ہے متاعِ صبر لوٹ — ہے بھری اس میں شرارت کوٹ کوٹ

اہلِ محفل پر ہے اس کو برتری ہے چلم سے سر پہ تاجِ سروری
ہر زمان ہے دلنوازِ اہلِ ساز نالۂ خوش سے دمبدم ہونے نواز
نقش زن ہے دورِ سے بر روئے باد یعنی آغا فلکم ممدود باد
گر غذا کو کیجئے اس کی خیال ہے خمیرے کی بس اک مٹکی میں لال
سونی ہے محفل نہ ہو جب اسکو باد فی الحقیقت ہے یہ مجلس کا منگھار

لب بلب ہیں ہم تو اس سوائے کرم
اس گنہ سے کیونکر منکر ہوئیں ہم

مکتوبِ حمید

"ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ سابق پروفیسر قانون بین الممالک، جامعہ عثمانیہ (اداہ اللہ فیضہم) اور معارف کے مخلص قدر دانون مین ہین، وہ جہان کہین بھی رہتے ہین، معارف کو نہین بھولتے، چنانچہ آجکل وہ پیرس مین ہین، وہان بھی اوس کو منگاتے ہین، اردو املا اور رسم الخط سے اُن کو خاص دلچسپی ہے، اس پر انھون نے کچھ کام بھی کیا ہے، اس لئے انھون نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب لکچرار اردو کالج کراچی کے مضمون اردو املا کی تاریخ کو بہت پسند کیا اور اس کے متعلق بعض مفید مشورے بھی دئیے ہین، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والون کے لئے ہم ان کا خط شائع کرتے ہین،" "م"

پارس

۱۳ر شوال المکرم ۱۳۷۰ھ

محترم جناب شاہ صاحب :- سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

کل شام کی ڈاک مین جون ۵۱ء کا معارف ملا، مسرت سے ورق گردانی کی، اردو املا کی تاریخ پر ایک عمدہ مضمون نظر سے گذرا، اس سے کئی وجوہ سے مجھے دلچسپی ہوئی، بلکہ عرصہ سے تمنا تھی کہ کوئی باہمت اہلِ علم ادھر توجہ کرین، موجودہ مضمون "تقابلی املائیات" کے لئے اردو دانون کے حلقے سے باہر بھی خوش آمدید سمجھا جائیگا اور مین یہان ادارۂ السنۂ شرقیہ مین اسے روشناس کراؤن گا،

لیکن یہ ایک وسیع مضمون ہے، اور نہ صرف یہ کہ فاضل مقالہ نگار کو اپنی تلاش جاری رکھنی چاہئے، بلکہ ضرورت ہے کہ دیگر اہلِ علم بھی اپنے معلومات اور اپنی تحقیقات کے نتائج سے اس بحث کی تکمیل مین حصہ لین،

میں سمجھتا ہوں کہ املا کے ارتقا میں تین پہلو خاص کر موثر ہوتے ہیں :-

۱- پہلے یہ کہ جب کوئی "بولی" (یعنی غیر علمی محض بولی جانے والی زبان) پہلے پہل "لکھی" (یعنی تحریری زبان) بنتی ہے، تو کچھ تو صحیح تلفظ کی تلاش میں "مشق وخطا" کو ناگزیر دخل ہوتا، اور یہیں اختلافاتِ املا سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور کچھ گاؤں گاؤں کی بولی الگ ہونے اور تلفظ میں باہم اختلاف ہونے کے باعث مختلف اہلِ قلم کے ہاں نہ صرف مختلف ادوار میں بلکہ خود ہمعصروں میں املا کی حد تک فرق ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ بقائے اصلح کے طور پر کسی ایک جگہ کی بولی سب پر غالب آجاتی ہے،

۲- دوسرے یہ کہ خود تلفظ میں مختلف اسباب سے ارتقا یا فرق پیدا ہو جاتا ہے، بیرونی اقوام سے تماس، خاص کر غیر زبان بولنے والوں کے تسلط کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے، اول الذکر امر کے سلسلہ میں سہولت پسندی بھی ایک خاص رجحان ہے، اسلئے اردو ہی نہیں ساری دنیا کی زبانوں میں (ہ) کی آواز غائب ہوتی جارہی ہے، مثلاً انگریزی میں اب (honour) کو ہانر کوئی نہیں کہتا، اگرچہ انگریزی میں اب بھی (H) کا تلفظ بہت کچھ باقی ہے، فرانسیسی میں اب (H) کا لکھنا تو بدستور ہے، مگر بولنا یا پڑھنا اب عملاً زبان سے غائب ہو گیا ہے، اطالویوں نے تو حد کردی ہے کہ اپنے حروفِ ہجا سے (H) کو حذف ہی کر دیا ہے، یہ چیز اردو میں بھی نمایاں ہے، اردو ہائے مخلوط کی مثالوں سے اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے، مثلاً ساتھی میں تو وہ بولا جاتا ہے، لیکن ہاتھ کا تلفظ اب عملاً صرف ہات رہ گیا ہے، ثانی الذکر کے سلسلہ میں شاید علاقہ براڑ کا برار بن جانا انگریزی اثر کا نمونہ سمجھا جا سکتا ہے،

(۳) تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی لکھی جانے والی زبان اپنا رسم الخط کسی نوبت پر بدل ڈالے تو نئے خط میں املا کو متعین ہوتے ہوتے کافی عرصہ لگتا ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے ترکی زبان اس کا ایک دلچسپ نمونہ ہے، گذشتہ پچیس تیس سال میں نہ صرف املا میں بار بار تبدیلی ہوتی رہی ہے، بلکہ خود تلفظ پر بھی اثر پڑ رہا ہے، اگر پہلے ترکی (عربی) خط میں چھوٹے حروفِ علت (زبر زیر پیش) نہ ہونے سے تلفظ متاثر ہو رہا تھا، تو اب لمبے حروفِ علت (آ، ی، و) غائب ہیں، قلی اور قالی ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں،

اس سے قطع نظر غیر زبانوں کے الفاظ و اصوات کی تحریر ایک مستقل مسئلہ ہے، عربی زبان میں (پ چ ژ گ ٹ ڈ ڑ ھ ے ں) جن سے ہمیں روزمرہ سابقہ ہے، نہیں ہیں، جب ہم نے اپنی بولی کو عربی خط میں لکھنا شروع کیا، تو یہ نئے حروف ایک دن میں نہ تو سوجھ سکتے تھے، اور نہ مقبول و مروج ہی ہو سکتے تھے،

شاید محترم مقالہ نگار کو اس سے دلچسپی ہوگی، اکبری دور کے ایک ملیباری مؤلف زین الدین المعبری نے جب عربی میں تحفۃ المجاہدین فی اخبار البرتغالیین لکھی، تو انھوں نے بھی ملیبار کے شہروں اور آدمیوں کے ناموں میں (ڈ) اور (ٹ) وغیرہ کو (د) اور (ت) ہی لکھا ہے، جیسا اس کتاب کے مخطوطوں میں نظر آتا ہے، اور لزبن کے مطبوعہ اڈیشن میں بھی اسکو ملحوظ رکھا گیا ہے،

ممکن ہے اہلِ علم اس کام کو بھی آگے بڑھائیں، جس میں ناچیز نے بھی حصہ لیا ہے، اور جس میں اس کی تلاش عمل میں لائی گئی ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں عربی خط میں لکھی جانے والی زبانوں میں مختلف غیر عربی آوازوں (پ، ٹ، ڈ وغیرہ) کو ادا کرنے کے لئے کیا نئے حروف یا علامتیں ایجاد کیں، اور آیا ایک ہی آواز کے لئے مختلف مقاموں پر مختلف حروف تو نہیں برتے جاتے، اور ممکن ہو تو اس میں اتحاد و ہم آہنگی کا انتظام کیا جائے،

جون کا معارف تو مل گیا، لیکن اپریل اور مئی کے پرچے غائب ہیں، جون کے پرچے میں جو شش ماہی فہرست چھپی ہے اس سے تو معلوم ہوا کہ دانتے کی نظم "طربیہ ربانی" کا مضمون جو بھیجا گیا تھا، وہ شاید اپریل میں چھپ بھی گیا، لیکن دیکھنے سے تا حال محروم رہا، معلوم نہیں ڈاک کے ان ڈاکوؤں کا کیا علاج ہے؟

مخلص محمد حمید اللہ

ادبیات

تفہیم

از

جناب شہ زور کاشمیری

پلک جھپکتے مین کرتی ہے کوئی برقِ نگاہ
کسی کا خرمنِ تمکین و عقل و ہوش تباہ

اثر پذیر یقیناً ہے قلب انسان کا
خیال و فکر کی ابلہ فریبیان ہین گواہ

کرشمہ ہے یہ فقط ایک اثر پذیری کا
مخل سکون مین جو تیری ہے موجِ آہ و واہ

یہی ہمارکشِ ناقۂ اصول بھی ہے
کہ یہ بدلتی ہے دنیا مین زندگی کی راہ

اسی کے غلبہ سے انسان ہے تلون کیش
کبھی ہے راہ نما اور کبھی ہے سنگِ راہ

کبھی ہے قوم پرست اور کبھی ہوالاتی
کبھی ہے دشمنِ دستار و جُبّہ و تاج و کلاہ

ہے تازیانۂ تحریکِ خواہشِ انسان
لچک جہان کے تقاضون کی با نشاطِ گناہ

جہانِ نو کے بدلتے ہوئے تقاضون سے
کبھی گنہ ہے ثواب اور کبھی ثواب گناہ

ہر اک اسکے سب منکرون کی نظرون مین
جہان - یہ بقول انوارِ معرفت - بھی سیاہ

خرابِ وہم و گمان و خیال ہو انسان
اثر پذیری کی یہ ہے عقیق خدا کی پناہ

نہ اسے اسیرِ خیالات و ظلمتِ ادراک
خدا کا جلوہ ہے تو ہر جہان ہے جلوہ گاہ

حیات جس کی ہے اصل انتظامِ کن فیکون
دخیل اس کے مقدر مین کیا ہون انجم و ماہ

یقین و عشق ہے مطلوب تجھ سے اے انسان
تو کر رہا ہے خرد او ہوس کے ساتھ نباہ

مدارِ فعل و خیالات و قول ہو قرآن
یہی ہے اَشہَدُ اَن لا الٰہ الا اللہ

گھر گھر اندھیرا گھر گھر اجالا

از

جناب حامد اللہ صاحب افسر

کس کس کو تو نے کیا کیا نہ بخشا، پیارے اللہ پیارے اللہ
قدرت کا تیری ادنیٰ کرشمہ ایک ایک ذرہ [illegible]

ہر اک زبان پر تیرا فسانہ ہر ایک لب پر تیرا ترانہ
بیگانہ [illegible] سب کا یگانہ [illegible]

خلوت کے اندر محفل ہے تو اندر، دریا کے اندر ساحل ہے تو
آنکھوں سے پردہ گھر دل ہے تو [illegible]

ہے تیرا پردہ شب کی سیاہی، تارون نے دی [illegible] گواہی
ہے تیرا منظر ہر شے الٰہی، ہر شے سے ظاہر ہے نور تیرا

خشکی کبھی ہے باران کبھی ہے مشکل کبھی ہے آسان کبھی ہے
ظاہر کبھی ہے پنہان کبھی ہے گھر گھر اندھیرا گھر گھر اجالا

بے ساز بن کر باساز بن کر، خاموش رہ کر آواز بن کر
ہر راز مین ہو ہمراز بن کر خود راز ہو کر ہر راز کھولا

ظاہر [illegible] کثرت باطن مین وحدت [illegible]
ظاہر [illegible]

قرار بن کر انکار بن کر آسان [illegible] دشوار بن کر
رفتار بن کر گفتار بن کر، ہر رنگ مین ہے تو آشکارا

خود ہی مسافر خود ہی سفر ہے خود ہی ہے منزل خود راہبر ہے
خود ہی ادھر ہے خود ہی ادھر ہے تجھ تک گیا ہے ہر ایک رستا

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

کی تنقید کے جوابات

از

نواب محمد خادم حسن صاحب معینی گدڑی شاہی مراد آبادی ثم الاجمیری

رسالۂ معارف کی اشاعت ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جو تنقید سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے نے معین الارواح پر کی ہے، وہ ایسے ایام میں میری نظر سے گذری جب کہ میں "معین الارواح" پر نظر ثانی کرکے ریوائزڈ ایڈیشن کا مسودہ تیار کر رہا تھا، میں عزیز ناقد کا مشکور ہوں کہ اُن کی تنقید زیادہ تفصیلات کے ساتھ مسودہ تیار کرنے کا باعث بنی، اس سلسلہ میں یہ امر بھی ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ یہ تنقید محض اس لئے کی گئی ہے، کہ کتاب "بزم صوفیہ" مؤلفہ ناقد کو اُن اعتراضات سے بچایا جائے، جو اُس پر معین الارواح کے پیش نظر وارد ہوتے ہیں"، مگر ہم اُس چیز کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے، موصوف کی تنقید کو نیک نیتی پر محمول کرتے ہیں،

نیز عزیز ناقد کی اس صاف بیانی اور اخلاقی جرأت کی قدر کرتے ہیں جس کا مظاہرہ موصوف نے اپنی معذرت مندرجہ معارف ص ۳۰۷ میں بایں الفاظ کیا ہے،

"عاجز راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم صوفیہ میں تذکرہ نویسوں پر بھروسہ کرکے یہ لکھدیا ہے کہ

دہلی سے اجمیر گئے جہاں دسویں محرم ۵۶۱ھ میں نزول اجلال فرمایا، اور وہیں آخر وقت تک قیام رہا، اس زمانہ میں اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجہ پتھورا تھا،

اب مزید تحقیقات کے بعد یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہوگیا ہے، بزم صوفیہ میں ایک اور تسامح ہوگیا ہے، صفحہ ۱۴۱ پر محمد یادگار کو اصفہان کا حاکم لکھ دیا ہے، اس سلسلہ میں بھی تذکرہ نویسوں میں کچھ اختلاف ہے، خزینۃ الاصفیاء (جلد اص ۲۵۸) میں ہے کہ محمد یادگار ہرات کا حاکم تھا، لیکن زیادہ تر تذکرہ نویسوں نے اُسے سبزوار کا حاکم بتایا ہے، اور یہی صحیح ہے"

جوابات لکھنے سے قبل پہلے مختصراً روایات کے متعلق کچھ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے، روایات کا حال یہ ہے کہ نہ صرف مختلف تذکروں میں متضاد روایات بکثرت ہیں بلکہ ایک ہی تذکرہ میں متضاد روایات اور ایک ہی روایت میں متضاد بیان تک موجود ہیں، اس اجتماع ضدین میں سے کوئی صحیح نتیجہ نکالنا آسان نہیں، اسی وجہ سے اجمیر گورنمنٹ کالج کے ایک تاریخ دان یورپین پرنسپل نے موجودہ تذکروں کو نامکمل پاکر مورخانہ طور پر ایک مکمل تذکرہ لکھنے کے لئے بڑے شد و مد کے ساتھ قلم اٹھایا تھا، مگر متضاد روایات، غیر واضح بیانات اور دوسری تاریخی پیچیدگیوں نے موصوف کی ہمت پست کر دی اور وہ بادلِ ناخواستہ اس سے باز رہے، چنانچہ معین الارواح لکھنے کے بعد راقم بھی اکثر کہا کرتا تھا کہ دوسری متضاد روایات سے ایک دوسرا ایسا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے جو پہلے سے بالکل مختلف ہوگا، ان حالات میں صرف مختلف تذکروں کا تجزیہ کافی نہ ہوگا بلکہ بعض روایات کے تجزیہ کی بھی ضرورت پیش آئے گی، میں نے یہ سمجھ کر طول سے اجتناب کیا تھا کہ اس قسم کے مباحث سے عوام کو کوئی خاص دلچسپی نہ ہوگی اور صاحبانِ علم کے لئے جو مختصر طور پر معین الارواح میں لکھ دیا گیا ہے وہ کافی ہے، مگر اب جب کہ موصوف کی تنقید کے پیش نظر ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ مرقومہ تفصیلات ہوتے ہوئے بھی صاحبانِ علم تک کو کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں پس و پیش ہے تو میں نے معین الارواح کے ریوائزڈ ایڈیشن

مین مزید تفصیلات اور جدید انکشافات کا اضافہ کر دیا، اگرچہ عزیز ناقد کے تاریخی اعتراضات کے مکمل اور مفصل جوابات نظر ثانی شدہ معین الارواح مین ضمناً آگئے ہین مگر ان مین سے بعض اعتراضات کے مختصر جوابات براہ راست دینا ضروری ہین، غالباً عزیز ناقد نے سرسری طور پر روایات کا مطالعہ کرنے کے بعد بعض غلط فہمیون کی بنا پر یہ اعتراضات کئے ہین، ہمین امید ہے ہمارے ان جوابات سے عزیز ناقد کو اطمینان حاصل ہو جائے گا اور مزید اطمینان کے لئے وہ معین الارواح کی طباعت ثانی کا انتظار کرین گے،

شاید عزیز ناقد کو یہ نہین معلوم کہ جس زمانہ مین معین الارواح فراق اجمیر سے متاثر ہو کر تسکین خاطر کے لئے لکھی گئی ہے اس زمانہ ہندوستان مین قتل و خون ریزی کا تھا کسی دوسرے شہر مین جا کر کسی اچھی لائبریری سے فائدہ اٹھانا تو در کنار اگر وہین بے تکلف چلنا پھرنا غیر ممکن تھا پس ان حالات مین ہم بعض ایسی کتابین فراہم کرنے سے قاصر تھے جو بقول عزیز ناقد آسانی سے مہیا ہو سکتی تھین،

عزیز ناقد مسالک السالکین کے حوالہ جات پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہین: "حال کی کسی تصنیف کو کثرت استعمال کرنا احتیاط کے خلاف ہے" شاید موصوف کو یہ نہین معلوم کہ ہم نے بہت سی کتابین دیکھنے کے بعد صاحب مسالک السالکین کو مستند راوی قرار دیا ہے، یہ وہ کتاب نہین ہے جس کا حوالہ معین الارواح ص ۵۰ مین با این الفاظ ..... "کہ صاحب مسالک السالکین کا بحوالہ سیر العارفین بیان ہے کہ جب آپ (حضرت خواجہ) لاہور پہنچے تو ان ایام مین سلطان معز الدین سام نے دہلی فتح کیا اور قطب الدین ایبک کو اپنا نائب بنا کر خود غزنین کی طرف روانہ ہوا اور اثنائے راہ مین واصل بحق ہوا" دینے کے بعد بندہ کو ناقد کے اس اعتراض کہ "سیر العارفین مین یہ عبارت نہین ہے" کے جواب مین عزیز ناقد کی طرح تذکرہ نویسون پر بھروسہ کرنے کے جرم مین "معارف" کے

ص ۰۰ ۱ پر معذرت کرنا پڑتی ملکہ مسالک السالکین مین صحیح روایات نقل کرنے کی تصدیق ہندوستان کے بعض ایسے مشہور محتاط علماء تک نے بھی کی ہے جو مولف مسالک السالکین کے ہم مشرب یعنی صوفی بھی نہین ہین، رسالہ معارف صفحہ ۳۰۳ پر عزیز ناقد لکھتے ہین:

"ممکن ہے وہ (حضرت خواجہ) ہندوستان سے کئی بار باہر تشریف لے گئے ہون اور پھر واپس آئے ہون ان کے بارہ مین تو مشہور ہے جیسا کہ فاضل مولف (معین الارواح) نے بھی لکھا ہے کہ وہ اجمیر سے ہر سال حج کے لئے جاتے تھے (صفحہ ۷۵) حج سے واپسی مین بلاد اسلامیہ کی سیر بھی کرتے ہون اس لئے اس سے انکار نہین کیا جاتا کہ وہ چار بار ہندوستان تشریف نہین لائے ہون گے لیکن اس سلسلہ مین فاضل مولف نے جو دلائل دیئے ہین وہ اطمینان بخش نہین ہین"

جواب: - مین نے معین الارواح کے صفحہ ۷۵ پر ہر سال حج کو جانے کے متعلق کچھ نہین لکھا، البتہ صفحہ ۱۴۴ پر سوانح کے بعد حصۂ سیرت مین بقوت روحانی آپ کا سالانہ حج کو جانا لکھا ہے، جب یہ جانا بقوت روحانی یعنی اسباب ظاہری سے بے نیاز ہو کر کراماتہً تھا تو ایسی صورت مین عزیز ناقد کا اس کو اسباب ظاہری کے ساتھ تشریف لیجانے کے سلسلہ مین تصور کرنا صحیح نہین، مین نے جو چار بار وارد ہندوستان ہونا لکھا ہے وہ اسباب ظاہری کے ساتھ ہے نہ کہ کراماتہً، اس لئے سالانہ حج کے لئے تشریف لیجانے کی روایت کو عزیز ناقد کا حضرت خواجہ کے چار مرتبہ ورود ہند کے سلسلہ مین بطور تائید کے پیش کرنا صحیح نہین جیسا کہ معین الارواح کے مندرجہ ذیل بیانات سے ثابت ہے:-

بیان معین الارواح صفحہ ۱۴۴: - "حضرت قطب الاقطاب فرماتے ہین کہ آپ ہر سال اجمیر شریف سے واسطے زیارت خانۂ کعبہ کے (بقوت روحانی) تشریف لیجاتے تھے، اگرچہ آپ کا کلام کسی کو سمجھ نہ آتا تھا بظاہر آپ اپنے حجرہ مین معتکف رہتے تھے، لیکن جو لوگ حج کو جاتے تھے وہ آپ کو طواف کعبہ مین مشغول پاتے تھے، آخر معلوم ہوا کہ آپ ہر شب کعبہ تشریف لیجاتے ہین اور صبح کو نماز سے قبل

واپس آکر نماز فجر اپنے جماعت خانہ مین ادا کرتے ہین"

عزیز ناقد نے اپنے مذکورۂ بالا بیان مین حضرت خواجہ کے چار بار وارد ہند ہونے کے متعلق جو احتمالی پہلو نکالے ہین، وہ معین الارواح کا دوسرا اڈیشن دیکھنے کے بعد ہمین امید ہے کہ یقین سے بدل جائیگا تاہم اس جواب مین بھی اس کے متعلق کچھ مختصراً عرض کر دیا جاتا ہے، موصوف نے اپنے بعض اعتراضات مین جیسا کہ ان جوابات کے پڑھنے سے ثابت ہوگا، تفصیلات حذف کر دی ہین،

عزیز ناقد اپنے بیان مین یہ بھی فرماتے ہین: "لیکن اس سلسلہ مین یعنی چار بار ورود ہند کے سلسلہ مین فاضل مولف نے جو دلائل دیئے ہین وہ اطمینان بخش نہین ہین" عزیز ناقد کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم نے مختلف زمانون مین چار بار وارد ہند ہونیکے متعلق جو چار روایات نقل کی ہین اگر وہ روایات ان کتابون مین نہ ہون جن کا حوالہ دیا گیا ہے یا ان روایات مین جو ورود کا زمانہ لکھا گیا ہے وہ موجود نہ ہو تو البتہ عزیز ناقد کا لکھنا صحیح ہو سکتا ہے، مگر ایسا نہین ہے، اس لئے بیان دلائل کا کوئی سوال پیدا ہی نہین ہوتا بلکہ صرف ان روایات کے متعلق یہ تنقیح ہو سکتی ہے کہ آیا وہ مع زمانہ ورود ان کتابون مین موجود ہین یا نہین جن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی تشریح حسب ذیل ہے،

پہلے ورود کے متعلق معین الارواح کا بیان:- آپ (حضرت خواجہ) بتاریخ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ ہندوستان مین تشریف فرما ہوئے" ص ۱۰ (ماخوذ از فرشتہ وغیرہ)

یہ روایت تاریخ فرشتہ اردو جلد دویم کے صفحہ ۳۷۵ اور خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۲۵۹ (مطبوعہ نولکشور پریس) مین موجود ہے،

دوسرا ورود:- اس ورود کے متعلق عزیز ناقد کو اعتراض ہے کہ مین نے معین الارواح صفحہ ۱۰ مین جو ذیل کی روایتین نقل کی ہین

روایت اول:- غزنین سے روانہ ہو کر آپ پہلی بار بروایت متواتر بتاریخ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ ہندوستان مین

تشریف فرما ہوئے، اس وقت خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی (جو بہرام شاہ کا پوتا تھا) لاہور مین حکمران تھا۔ (ماخوذ از فرشتہ وغیرہ)"

روایت صفحہ ۱۰ "اگر اس زمانہ مین رونق اسلام صرف لاہور و ملتان تک تھی اور یہی ہر دو مقامات شمالی ممالک سے آنیوالے کے لئے قیام و سیر کے قابل تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس ورود ہند کے موقع پر آپ صرف لاہور و ملتان تک ہی تشریف لائے۔ (ماخوذ از تاریخ فرشتہ وغیرہ)"

نمبر ۲ و ۵۵۲ھ مین خسرو شاہ غزنوی نے انتقال کیا اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور مین تخت نشین ہوا اسے شکست دیکر غیاث الدین محمد سام نے ۵۸۳ھ مین لاہور پر قبضہ کر لیا، (روضۃ الصفا)

نمبر ۳ (الف) ۳۹۶ھ مین سلطان محمود غزنوی نے ملتان تسخیر کیا، ور لشکر کے احضار کا حکم نافذ کیا، اس لئے کہ ملتان کا والی شیخ حمید لودھی امیر ناصر الدین سبکتگین سے اخلاص کا سلوک رکھ کر خدمات شائستہ بجا لاتا تھا،

(ب) ۴۱۷ھ مین سومنات کی واپسی پر سلطان محمود غزنوی سندھ کے بیابان کی راہ سے ملتان جا رہا تھا کہ ایک ہندو رہبر نے بسبب دشمنی سلطان کو مع لشکر کے بے آب بیابان مین پہنچا دیا تاکہ ہلاک ہو جائے، سلطان نے رہبر کو سزا سے قتل دی اور خود غزنین روانہ ہوا اور ۴۱۸ھ مین مع ایک لشکر عظیم کے ملتان کی طرف رخ کیا اور وہان پہنچکر ایک جنگ عظیم کے بعد ان جتون کی گوشمالی کی اور تسخیر کیا،

(ج) ۴۳۲ھ مین محمد کہول نے اپنے چھوٹے لڑکے کو سپہ سالار پشاور اور ملتان کا مقرر کیا،

(د) ۴۴۱ھ مین علی بن ربیع غزنین سے پشاور کی طرف معہ ایک کثیر تعداد زر و جواہر کے بھاگا اور اپنے ہمراہیون کی مدد سے اس خطہ کو ملتان اور سندھ تک اپنے قبضہ مین لایا،

(ہ) بوجوہات مندرجۂ بالا ثابت ہے کہ ۵۶۱ھ مین یہان رونق اسلام تھی، (مولف)

ان کی تائید تاریخ فرشتہ سے نہیں ہوتی، تاریخ فرشتہ میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے:۔

"و خود بغزنین آمده شمس العارفین عبدالواحد را که پیر شیخ نظام الدین ابوالموید است دریافته بلاہور آمد و از آنجا بدہلی تشریف آورده چون ازدحام بوداع و عام از حد گذشت و آن بزرگوار از ان متنفر بود ہر آئینه از آنجا نیز متوجه بلدۂ اجمیر شده ده ماه محرم سنه ۵۶۱ھ (احدی ستین خمسمایه) سایۂ عطوفت بر ان خطه انداخت و سید السادات سید حسین المشہور بخنگ سوار که شیعه مذہب بود و بصلاح و تقوی آراسته و سلک اولیاء الله انتظام داشت و سلطان قطب الدین ایبک او را داروغہ آن بلده ساخته بود قدوم شیخ را باعزاز و اکرام تلقی فرمود و چون از علم و تصوف و اصطلاحات صوفیه بہرۂ تمام داشت صحبت خواجه را نعمت شگرف دانسته اکثر اوقات مجلس شریف حاضر می شد و بسیاری از کفار اجمیر ببرکت انفاس پیر طریقت بشرف ایمان مشرف گشتند و آنانکه ایمان نیاوردند محبت خواجه در دل جائے داده پیوسته فتوح بے حد و عد بحضرت او می فرستادند و خواجه در عہد شمس الدین التتمش دو مرتبه بجہت دیدن مرید خود قطب الدین بختیار کاکی بدہلی تشریف بردند"

(جلد دوئم ص ۳۷۶، معارف ستمبر ۱۹۵۰ء)

جواب: عزیز ناقد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شاید معین الارواح کے مندرجہ فٹ نوٹ (نمبر ۲ و نمبر ۳) کی عبارت نہیں پڑھی، جو مذکورہ روایات کی جزو ہے ورنہ وہ ہرگز یہ نہ لکھتے کہ فرشتہ میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے بلکہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ فرشتہ کی جلد اول میں وہی ہے جو معین الارواح صفحہ ۱۸ کے فٹ نوٹ نمبر ۲ و ۳ میں درج ہے، شاید موصوف فرشتہ کی جلد دوئم کے خیال میں رہے اور جلد اول پر انہوں نے نظر نہیں کی اگر اس کا مطالعہ کر لیتے تو ہرگز نہ لکھتے کہ مذکورہ بالا دعویٰ کی تائید فرشتہ سے نہیں ہوتی،

ورود دوئم کے متعلق عزیز ناقد کا دوسرا اعتراض معین الارواح کے مندرجہ ذیل بیان پر ہے،

بیان معین الارواح ص ۱۹ اجمالی، "حسب دلیل العارفین آپکے ورود ہند کے وقت اجمیر ہندوؤں کی ملکیت تھا اور حسب مسالک السالکین و تاریخ فرشتہ وغیرہ اجمیر میں پرتھوی راج کی حکومت تھی اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج پر آخر بار حملہ کرکے اجمیر فتح کیا، اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر لیا، چونکہ یہ واقعہ بالاتفاق ۵۸۸ھ میں ہوا ہے اس لئے آپ کا دوسری بار ورود ہند ۵۸۸ھ میں ہونا ثابت ہے"

وہ اعتراض یہ ہے کہ "حضرت خواجہ ۵۶۱ھ یا ۵۸۶ھ میں اجمیر آئے تو دونوں سنہ میں اجمیر ہندوؤں ہی کی ملکیت تھا لیکن اجمیر کا ہندوؤں کی ملکیت ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ حضرت خواجہ دوسری بار ہندوستان آئے، (معارف ص ۲۳۲)

جواب:۔ یہ صحیح ہے کہ ۵۶۱ھ اور ۵۸۶ھ دونوں سنین میں اجمیر ہندوؤں کی ملکیت تھا ہم نے صرف اس فقرہ سے یہ ثابت نہیں کیا ہے بلکہ آگے یہ بھی لکھا ہے کہ "حسب بیان مسالک السالکین و تاریخ فرشتہ وغیرہ اجمیر میں پرتھوی راج کی حکومت تھی" پس صرف ایک فقرہ لیکر اور دوسرے کو چھوڑ کر اعتراض کرنا صحیح نہیں، علاوہ ازیں اس جگہ صرف مجملاً چاروں ورود کا مختصر خلاصہ لکھا گیا ہے، شاید عزیز ناقد نے ورود دوئم کی تفصیل معین الارواح کے صفحہ ۳۵ پر نہیں پڑھی اگر وہ پڑھ لیتے تو یہ اعتراض نہ فرماتے۔ تفصیل مذکور حسب ذیل ہے،

عبارت معین الارواح صفحہ ۳۵ تحت ورود دوئم مع تفصیلات:۔ "اسرار الاولیاء و اخبار الاخیار کا بیان ہے کہ جب خواجہ بزرگ اجمیر تشریف لائے اس وقت رائے پتھورا فرمانروائے اجمیر تھا" چونکہ یہ روایت اخبار الاخیار مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی کے صفحہ ۲۳ پر موجود ہے، اس لئے ہمارا ورود دوئم کے متعلق استدلال غلط نہیں، ورود سوئم کے متعلق معین الارواح کا اجمالی بیان یہ ہے کہ [illegible] العارفین کا [illegible]

۱ معین الارواح کے ریوائزڈ ایڈیشن میں صرف اس فقرہ "اس زمانہ میں اجمیر ہندوؤں کی ملکیت تھا" سے بھی پرتھوی راج کا زمانہ ثابت کیا گیا

ہے کہ جب معز الدین سام غزنین جاتے ہوئے (۶۰۲ھ) مین واصل بحق ہوا اس زمانہ مین آپ وارد لاہور ہوئے

اعتراض:۔ اس بیان پر ناقد نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "فاضل مؤلف نے اپنے معروضہ مین لکھا ہے کہ ان کو سیر العارفین دستیاب نہین ہو سکی" (ص۔ ۵) اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا بیان سیر العارفین کے دیکھے بغیر قلمبند کیا گیا ہے، عاجز راقم کے پیش نظر اس وقت سیر العارفین کا اردو ترجمہ ہے، جو ۱۹۰۱ء مین شمس المطابع سے چھپ کر شائع ہوا ہے، اس مین حضرت خواجہ کے اجمیر شریف مین نزول اجلال کا ذکر ان الفاظ مین ہے: "بعدہٗ خواجہ صاحب شہر غزنین کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ عبد الواحد غزنوی پیر شیخ نظام الدین ابو المویدؒ کے ہین وہ اس جگہ موجود تھے، اُن سے ملاقات کی پھر وہان سے روانہ ہو کر لاہور مین آئے، ان ایام مین پیر علی ہجویری قدس سرہٗ کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن شیخ حسین زنجانی کہ پیر شیخ سعد الدین حمویہ قدس سرہٗ کے ہین زندہ تھے، ان سے اور خواجہ صاحب سے بے حد دوستی اور محبت ہو گئی، کچھ دنون تک وہان قیام فرما کر پھر وہان سے متوجہ دار الخلافہ دہلی کے ہوئے، جب اس مقام مبارک پر پہنچے چند عرصہ تک وہان قیام فرمایا وثاق بہتر کہ جناب خواجہ صاحب کا اس مقام پر پہنچا جہان کہ قبر شیخ رشید کی ہے، اور آج تک اس زمانہ کی نشانیون مین سے اُن کی مسجد کی محراب اب تک قائم ہے، غرض کہ دہلی مین ہجوم خاص و عام اہل اسلام کا خواجہ صاحب کے گرد بہت ہوا تب آپنے طرف دار الخیر اجمیر کا سفر کیا اگرچہ اس زمانہ مین اجمیر شریف مین اہل اسلام کی رونق شروع ہو گئی تھی، لیکن غلبہ کفار نابکار کا آس پاس اجمیر شریف کے بہت تھا، اس زمانہ کے خلیفۂ وقت سلطان قطب الدین ایبک نے سیادت پناہ میر سید حسین مشہدی کو اجمیر شریف مین داروغگی کی خدمت پر ممتاز فرمایا تھا (حصہ اول ص ۱۲) سیر العارفین کے مندرجہ بالا اقتباس سے کہین ثابت نہین ہوتا کہ حضرت خواجہ اس وقت لاہور وارد ہوئے جب معز الدین سام غزنین جاتے ہوئے (۶۰۲ھ) واصل بحق ہوا" (معارف ص ۲۳۲)

جواب:۔ شاید ورود سوم کی تفصیل مین عزیز ناقد نے معین الارواح کے صفحہ ۵۰ پر یہ عبارت نہین پڑھی اگر پڑھ لیتے تو وہ ہمین غلط بیانی کا ملزم نہ بناتے، عبارت حسب ذیل ہے:۔

(ص ۵۰) "صاحب مسالک السالکین کا بحوالہ سیر العارفین بیان ہے کہ جب آپ لاہور پہنچے ہین تو ان ایام مین سلطان معز الدین سام نے دہلی فتح کیا اور قطب الدین ایبک کو اپنا نائب بنا کر خود غزنین کی طرف روانہ ہوا اور اثنائے راہ مین واصل بحق ہوا" (معین الارواح صفحہ ۵۰) عزیز ناقد نے صرف سیر العارفین کا ترجمہ پڑھ کر ہمین غلط بیانی کا ملزم بنایا اگر وہ اصل نسخہ سیر العارفین فارسی مطبوعہ مطبع رضوی دہلی صفحہ ۱۲ کی یہ عبارت پڑھ لیتے تو شاید یہ الزام نہ لگاتے، وہ عبارت یہ ہے،

عبارت سیر العارفین ص ۱۲: "خود عزیمت بجانب غزنین .... حیات بود میان حضرت زبدۃ المشائخ والاولیاء معین الحق والدین قدس سرہٗ و حضرت شیخ المشائخ والاولیاء شیخ حسین زنجانی قدس سرہٗ محبتے و اتحاد فوق الحد واقع شد، و گویم دران ایام سلطان معز الدین محمد سام طاب ثراہ دہلی را فتح نمود و سلطان قطب الدین ایبک خاصہ غلام او بود دار الخلافت دہلی گذاشتہ در طرف غزنین روان شد در اثنائے راہ برحمت حق پیوست، حضرت زبدۃ المشائخ معین الحق والدین قدس سرہٗ از شیخ حسین زنجانی رخصت گرفتہ متوجہ بسمت دار الخلافت دہلی گشت"

پس سیر العارفین کے مندرجہ بالا بیان سے یقیناً یہ ثابت ہے کہ حضرت خواجہ اس وقت وارد لاہور ہوئے جب معز الدین سام غزنین جاتے ہوئے (۶۰۲ھ) مین واصل بحق ہوا،

ورود چہارم:۔ کے متعلق عزیز ناقد لکھتے ہین کہ معین الارواح کا بیان حسب ذیل ہے:۔

"خزینۃ الاصفیا کا بیان ہے کہ جب حضور خواجہ معین الدین حسن چشتی علیہ رحمۃ خراسان سے وارد ہندوستان ہوئے اُس وقت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ اور حضرت جلال الدین تبریزی

دونوں مل کر شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے تشریف لے گئے تھے اور جب کہ یہ بزرگوار
حضرات (یعنی شیخ بہاء الدین علیہ الرحمۃ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین
بختیار کاکیؒ) ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے، اس وقت قباچہ بیگ (ناصر الدین قباچہ) حاکم
ملتان خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ لشکر کفار مغل ملتان تسخیر کرنے آیا ہے، لشکر بے شمار ہے
مجھے مقابلہ و مجادلہ کی طاقت نہیں ہے خدا کے لئے میری امداد فرمایئے،

اتفاقاً اس وقت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا، اور
حضرت قطب صاحب نے حاکم ملتان (قباچہ بیگ) کو دیا اور فرمایا یہ تیر رات کے وقت دشمن کے
لشکر میں پھینک دینا اور مطمئن ہو جانا، قباچہ بیگ نے یہ عمل کیا اور دشمن کے لشکر میں سے کوئی متنفس
ایسا نہ بچا جو تیر خوردہ نہ رہا ہو، تمام کفار نے راہ فرار اختیار کی"۔ چونکہ صاحب منتخب التواریخ کا
بیان ہے کہ ۵۶۱ھ میں مغلوں نے فوج کشی کی اور چالیس دن تک ملتان کا محاصرہ کیا، اس لئے
یہی سنہ یعنی ۵۶۱ھ غریب نواز کی خراسان سے واپسی ہندوستان اور ورود لاہور کا ہے۔

(معین الارواح ص ۵۷)

اس پر ناقد لکھتے ہیں کہ: مذکورہ بالا بیان خزینۃ الاصفیا کی حسب ذیل روایت سے لیا
گیا ہے جو حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں درج ہے:۔

"نقل است کہ وقتیکہ خواجہ معین الحق والدین از خراسان دارد ہند و ملتان شد خواجہ
قطب الدین بختیار و شیخ جلال الدین تبریزیؒ باتفاق ہم دیگر باشتیاق ملاقات شیخ
بہاء الدین زکریا ملتانیؒ در ملتان تشریف بردند، روزے ہر سہ بزرگوار در یک مجلس
تشریف می داشتند کہ قباچہ بیگ حاکم ملتان بخدمت حاضر آمدہ عرض کرد کہ لشکر کفار
مغل برائے تسخیر ملتان آمدہ اند و لشکر بے شمار دارند، و مرا طاقت مقابلہ و مجادلہ با ایشان

نیست برائے خدا امداد فرمایند، اتفاقاً خواجہ قطب الدینؒ دران وقت تیر بدست خود داشت
حوالہ حاکم ملتان کرد و فرمود کہ این تیر بوقت شب در لشکر دشمن بیند از و فارغ بنشین،
قباچہ ہم چنان بعمل آورد و در لشکر دشمن متنفسے نماند کہ زخم تیر باو نرسیدہ باشد، و ہمہ کفار
روبفرار نہادند۔ (جلد اول ص ۲۶۸)

اس کو نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ خزینۃ الاصفیا کی مندرجۂ بالا روایت غالباً سیر الاقطاب
(ص ۱۴۹) سے لی گئی ہے، سیر الاقطاب کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بختیار کاکیؒ اپنے مرشد
کے ساتھ ہندوستان نہیں آئے، انھوں نے یہ خبر سنی کہ حضرت خواجہ خراسان سے ہندوستان
جا رہے ہیں تو مرشد کے شوق ملاقات میں وہ بھی ہندوستان روانہ ہو گئے، ملتان پہنچے، وہاں سے
دلی آئے اور دہلی سے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی، لیکن ان کو حکم ملا کہ وہ دہلی میں
قیام کریں، لیکن دلیل العارفین (مجموعۂ ملفوظات حضرت خواجہ معین الدینؒ) کے بیان کے
مطابق "حضرت خواجہ قطب الدین ہندوستان اور پھر اجمیر اپنے مرشد کی معیت میں آئے
دلیل العارفین کی مجلس یازدہم میں ہے:۔

"چون خواجہ درین خواہد رسید، چشم پر آب کرد، فرمود مسافر می شوم جائیکہ مدفن ما خواہد
بود یعنی در اجمیر می روم ہر کسے را وداع کرد، دعاگو بہ دراہ بودیم، بعد ازان در اجمیر
رسیدیم و آن روز اجمیر ازان ہندوان معمور آباد و مسلمانی چنان نبود،
چون قدم مبارک خواجہ آنجا رسید چندان اسلام ظاہر شد کہ آن را
حد نبود۔ (ص ۵۴-۵۵)

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ دلیل العارفین کی روایت کو یا سیر الاقطاب و خزینۃ الاصفیا کے بیانات
کو قابل قبول سمجھا جائے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذکر میں خزینۃ الاصفیا کا ایک بہت واضح بیان

ہے جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ میں اجمیر وارد ہوئے اور وہیں مستقل قیام
فرما کر رشد و ہدایت اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ بیان ملاحظہ ہو:۔

"در ین بعد حضرت خواجہ از بلخ بغزنین آمد و بعد حصول صحبت شمس العارفین کہ ذکر آن سابق مذکور شد
خاطر لاہور شد و تا دو ماہ مزار پر انوار مخدوم علی علوی ہجویری لاہوری قدس سرہٗ معتکف ماند، بعد حصول فوائد باطنی
از لاہور روانہ دہلی گشت و چندی در دہلی قیام پذیر ماندہ بتاریخ دہم ماہ محرم سنہ پانصد و شصت و یک رونق
افزائے دار الخیر اجمیر گشت و در آنجا اول شخصے کہ شرف ارادت آنحضرت مشرف شد میر سید حسین خنگ سوار
بود کہ اول از ان مذہب شیعہ داشت و بعد از ان تائب شد، مرید گشت و بمراتب اعلیٰ رسید و من بعد ہزار
در ہزار از صغار و کبار بخدمت آن محبوب کردگار حاضر شدہ مشرف با شرف اسلام و ارادت آنحضرت شد بدیں گونہ
چراغ اسلام در ہندوستان بطفیل این خاندان عالیشان روشن گشت"۔ (معارف جلد ۱ ص ۲۴۹)

جواب:۔ خزینۃ الاصفیا کی مندرجۂ بالا روایت نہ صرف سیر الاقطاب صفحہ ۱۴۹ سے لی گئی ہے بلکہ یہ روایت سیر العارفین ص ۱۹، فرشتہ جلد دوم ص ۵۷۶ - ۵۷۷ اور گلزار ابرار ص ۴۰ میں بھی بتغیر الفاظ درج ہے اور ان میں سب سے پہلی کتاب سیر العارفین ہے۔

عزیز ناقد نے بحوالہ دلیل العارفین لکھا ہے کہ حضرت قطب صاحب اپنے مرشد کی بیعت میں ہندوستان پھر اجمیر آئے۔ ہم بھی اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں مگر یہ واقعہ ورود ہند بار دوم کا ہے نہ کہ چہارم کا، حضرت قطب صاحب ورود دوم میں پیر و مرشد کے ہمراہ اجمیر آ کر واپس اوش گئے، وہاں اپنی والدہ کے اصرار سے شادی کی اور بغداد پہنچے یہاں شیخ جلال الدین تبریزی نے انھیں غریب نواز کے دہلی پہنچنے کی خبر دی تو حضرت قطب صاحب ہندوستان روانہ ہو کر وارد ملتان ہوئے اور قباچہ بیگ کو تیر دیا تاکہ کفار مغلوں سے امن ملے۔ (دیکھو مسالک السالکین جلد دوم ص ۲۹۷ - ۲۹۸)

مندرجۂ بالا امور کی مزید تشریحات ہم نے معین الارواح کے دوسرے ایڈیشن میں پوری تحقیق کے ساتھ کی ہے

جیسن مسالک السالکین کے بیان سے بھی بعض جگہ اختلاف کیا ہے، مسودہ بحمد اللہ تیار ہو گیا ہے، خدا نے چاہا تو عنقریب شائع ہو کر عزیز ناقد کی سمجھ میں جو نہیں آتا ہے اس کو وہ سمجھا دے گا اور ان کو تسکین خاطر و اطمینان قلبی حاصل ہو جائے گا۔

عزیز ناقد نے ورود چہارم کے متعلق خزینۃ الاصفیا کا جو واضح بیان یا دوسرے الفاظ میں سیر العارفین ص ۱۹ کی مندرجۂ بالا روایت کی تردید میں لکھا ہے وہ کسی طرح صحیح نہیں، وہ خود سیر العارفین کے بیان سے مرتب کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی ایک ورود کی روایت کو بقیہ تینوں ورود کی روایات کی تردید میں پیش کرنا کسی طرح صحیح نہیں، ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی اور ایک روایت سے چاروں ورود میں سے کسی ایک ہی کی تائید ہو گی، اس لئے ان میں سے کوئی ایک کسی دوسری روایت کی تردید کا ذریعہ نہیں بنائی جا سکتی،

اس طرح تو خود خزینۃ الاصفیا کے ایک بیان کی تردید دوسرے بیان سے ہوتی ہے، چنانچہ حضرت خواجہ کے ورود کے متعلق ص ۲۵۹ پر لکھتے ہیں کہ "حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آئے"، پھر صفحہ ۲۵۹ - ۲۶۰ پر لکھتے ہیں:۔

"چون خواجہ معین الحق والدین در اجمیر رسید بیرون شہر زیر درختے کہ شتران راجہ در آنجا نشستند مقام فرمود ...... بمدت قلیل لشکر سلطان شہاب الدین در ہند آمد و راجہ اجمیر (غالباً کھانڈے راؤ سے مراد ہے) بقتل رسید و رائے پتھورا را زندہ گرفتار کرد"، پھر صفحہ ۲۶۰ پر لکھتے ہیں:۔

"وقتیکہ خواجہ معین الدین وارد ہندوستان شد خواجہ قطب الدین بختیار و شیخ جلال الدین تبریزی باتفاق ہم دیگر باشتیاق ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی تشریف بردند روزے ہر سہ بزرگوار در یک مجلس می داشتند کہ قباچہ بیگ حاکم ملتان بخدمت حاضر آمدہ عرض کرد کہ لشکر کفار مغل برائے تسخیر ملتان آمدہ اند" ظاہر ہے کہ ۵۶۱ھ میں پتھورا کا زمانہ نہ تھا نہ ۵۶۱ھ میں پتھورا قتل ہوا، نہ ۵۶۱ھ میں کفار مغلوں نے بزمانہ قباچہ بیگ ملتان کا محاصرہ کیا، کتاب خزینۃ الاصفیا، سیر العارفین، فرشتہ، سیر الاقطاب و گلزار ابرار سے بہت بعد کی تصنیف ہے، نیز ورود ہند کے متعلق جو روایت عزیز ناقد نے خزینۃ الاصفیا کی معارف میں نقل کی ہے ہم نے معین الارواح کی نظر ثانی میں اس کا تجزیہ کیا ہے، در اصل یہ روایت فرشتہ سے لی گئی ہے۔

(باقی)

مطبوعاتِ جدیدہ

خاندانِ زبیری کنبوی

جلد اول و دوم مع ضمیمہ

از جناب مولوی حسین احمد صاحب زبیری کنبوی میرٹھی، تقطیع بڑی، ضخامت مجموعی ... صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی،

قیمت جلد اول ۸/ جلد دوم ۶/ ضمیمہ ۶/ پتہ: (۱) منشی صادق حسین صاحب زبیری مکان نمبرہ ۳ محلہ سرائے خیر نگر میرٹھ (۲) حسن احمد صاحب زبیری، گلشن زبیری آشیانہ، قریب درگاہ حبیب علی شاہ حیدرآباد دکن (۳)

ایم میاں زبیری فردوس جنرل اسٹورس، اسلامیہ وقف بلڈنگ فریئر روڈ کراچی (پاکستان)

صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع، اٹاوہ، مارہرہ، امروہہ، مراد آباد، اور بریلی وغیرہ میں زبیری کنبوی خاندان مشہور و معروف خانوادہ ہے، اس خاندان میں ہر زمانہ میں بڑے بڑے نامور اور اصحابِ کمال پیدا ہوتے رہے، نواب وقار الملک، ڈاکٹر ضیاء الدین، مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر اسی خاندان کی یادگار ہیں، اس خاندان کے نسب کے متعلق دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق ہندوستان کی نومسلم قوم کنبو یا کمبوج سے ہے، دوسری یہ کہ اس کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی حواریِ رسول حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، اسی نسبت سے یہ لوگ اپنے کو زبیری کہتے ہیں، اور کنبوی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کیجاتی ہے کہ حضرت زبیر بن عوام کی اولاد دوسری صدی ہجری میں سندھ کے مقام کنباہ میں آکر آباد ہوئی تھی، جس کی نسبت سے وہ کنبوی کہلائی جس نے بعد میں کنبوہ کی شکل اختیار کرلی، پھر یہ خاندان کنباہ سے دلی میں منتقل ہو کر اس کے نواح میں پھیل گیا، جہاں وہ اب تک آباد ہے، حسین احمد صاحب زبیری نے جو اس خاندان کے ممتاز فرد ہیں، اپنے خاندان اور قبیلہ کی تاریخ اور اس کے نسب کی تحقیق اور اس کی عربیت اور قریشیت کے ثبوت اور اس کی مخالف روایات کی تردید میں یہ ضخیم کتاب

لکھی ہے، اس میں انھوں نے عہدِ صحابہ سے لیکر موجودہ زمانہ تک اس خاندان کی تاریخ پر نگاہ ڈالی ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے بے شمار کتابوں کی ورق گردانی کی ہے، اور اسلامی ہند کی پوری تاریخ کھنگھال ڈالی ہے اور جہاں سے ان کو زبیری خاندان کے متعلق کوئی بیان ملا ہے، اس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا ہے، اور قریشیت کی روایات کو اپنے دعویٰ کے ثبوت اور دلیل میں پیش کیا ہے، اور مخالف بیانات و روایات کی تردید کی ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان کے بہت سے علماء و فضلا، صلحاء و اخیار، اور امراء و عمائد کے حالات، اسلامی ہند کے مختلف تاریخی واقعات اور مختلف النوع متفرق معلومات معرض تحریر میں آگئے ہیں جس سے اس کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے، مصنف کی یہ محنت اور تلاش و تحقیق لائق ستائش ہے کہ انھوں نے ایک محدود موضوع پر معلومات کا اتنا متنوع، دلچسپ اور مفید ذخیرہ فراہم کردیا ہے، جس سے یہ کتاب زبیری خاندان کی تاریخ کے ساتھ اسلامی ہند سے متعلق متفرق معلومات کا گنجینہ بن گئی ہے، کتاب کے تینوں حصوں کا مقصد ایک ہی ہے، لیکن پہلی جلد میں خصوصیت کے ساتھ زبیری خاندان کے نسب کے متعلق محمود احمد صاحب امروہوی مؤلف تاریخ امروہہ اور دوسری جلد میں چودھری وہاب الدین صاحب امرتسری مؤلف تاریخ کنبوہان اور ضمیمہ میں مولوی عبید اللہ صاحب فرحتی امروہوی کے مضامین اور بیانات کی تنقید و تردید کی گئی ہے، ہمارے نزدیک اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے معلومات کا تنوع اور اسکی کثرت ہے، جس میں ہر مذاق کی دلچسپی کا کچھ نہ کچھ سامان موجود ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ نجابتِ نسبی کا بھی ایک درجہ ہے، لیکن اسلام میں معیارِ شرافت انسان کے اعمال و اخلاق ہیں، زبیری خاندان کے لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ اس میں ہر دور میں بڑے بڑے اصحابِ کمال پیدا ہوئے، جس کا ایک نمونہ خود مصنف بھی ہیں، اور وہ معترضین سے کہہ سکتے ہیں کہ

المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست

اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را

حجِ کامل، مؤلفہ زائرِ حرم عبد لوحید صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۱ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت متعین نہیں، اصحاب خیر کی توفیق پر ہے، پتہ :- شبلی اسٹورس چوک اعظم گڈھ،

ہمارے شہر کے مشہور تاجر عبد لوحید اور فرید احمد صاحبان گذشتہ سال حج بیت اللہ کے شرف سے مشرف ہوئے تھے، عبد لوحید صاحب کو کچھ لکھنے پڑھنے کا بھی مذاق ہے، اس لئے انھون نے حجاج کی سہولت کیلئے یہ مفید رسالہ تحریر کیا ہے، اس مین حج وزیارت کے ضروری مسائل، آداب وشروط، حجاج کے لئے سفری ہدایات اور حرمین شریفین کے متعلق مفید متفرق معلومات جنکی عموماً حجاج اور زائرین کو ضرورت پیش آتی ہے، اختصار کے ساتھ قلمبند کئے ہین، اور آخر مین مشہور شعراء کی چند پُرکیف نعتیہ نظمین جو مدینہ طیبہ کی حاضری کیلئے ترانۂ شوق کی حیثیت رکھتی ہین، شامل کر دی ہین، اس طرح اس مختصر رسالہ مین سفر حج اور فریضۂ حج کے متعلق بہت سے ضروری مسائل ومعلومات آگئے ہین، جن سے واقفیت حجاج کے لئے ضروری ہے، اس لئے حجاج کے لئے یہ رسالہ مفید ہے، اس کی قیمت مصنف نے حرمین کے کارِ خیر کے لئے وقف کر دی ہے، اور خریدارون کی توفیق پر رکھی ہے، اس لئے اسکی خریداری ہم خرما وہم ثواب ہے،

لیلۃ المعراج ازجناب مولوی جلالی صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت :- ۸/ پتہ :- حافظ محمد غوث صاحب تاجر کتب چوک نانپارہ ضلع بہرائچ،

اس کتاب مین مصنف نے معراج نبوی کے واقعات نظم کئے ہین، معراج کے مراحل اتنے نازک ہین کہ جن شعراء نے اس پر طبع آزمائی کی ہے، اُن مین سے بہت کم کامیاب ہو سکے ہین، لیکن مصنف نے اس کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کیا ہے، اور حتی الامکان روایات کی صحت، واقعات کے استقصاء اور حسن بیان ہر پہلو کا لحاظ رکھا ہے، اس لحاظ سے یہ نظم کامیاب اور تمام پہلوؤن کی جامع ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق مین مقبول ہو گی،

"م"

جلد ۶۸ ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۱ء عدد ۳

مضامین